جنوری 2008
10 روپے
ماہنامہ
اردو دنیا
Annual Subscription
Surface Mail Air Mail
Nepal Rs 300 588
BanglaDesh Rs 132 420
Rest of World Rs 300 684
قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

دہلی میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے زیر اہتمام ڈراما ''آگرہ بازار'' کی نمائش کے موقعے پر ناظرین کی اگلی صف میں
پروفیسر مشیر الحسن، جناب سدیپ بنرجی، مرکزی وزیر جناب ارجن سنگھ، جناب حبیب تنویر اور جناب چندر بھان خیال۔

ڈراما ''آگرہ بازار'' کا ایک منظر

ماہ نامہ

اردو دنیا نئی دہلی

جلد۔10، شمارہ۔7، جولائی 2008

مدیر: ڈاکٹر علی جاوید

اعزازی مدیر: مخمور سعیدی

ناشر اور طابع:
ڈائرکٹر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارت ترقی انسانی وسائل، محکمۂ اعلیٰ تعلیم، حکومت ہند

کمپوزنگ: شہناز اختر

مطبع: ایس نارائن اینڈ سنز، بی۔88، اوکھلا انڈسٹریل ایریا، فیز-II، نئی دہلی-110020

مقام اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل

قیمت -/10 روپئے، سالانہ -/100 روپئے

ڈرافٹ NCPUL, New Delhi کے نام ارسال کریں۔

صدر دفتر:
ویسٹ بلاک۔1، ونگ-6
آر۔کے۔ پورم، نئی دہلی- 066 110
فون:26103938، 26103381
فیکس:26179657، 26108159
ویب سائٹ:
http://www.urducouncil.nic.in
email: urduduniyancpul@yahoo.co.in
urducouncil@gmail.com

شعبۂ فروخت:
ویسٹ بلاک-8، ونگ-7،
آر۔کے۔ پورم، نئی دہلی۔110066
فون:26169416، 26109746

شاخ: 110-7-22 تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس،
بلاک نمبر 1-5، پتھر گٹی، حیدرآباد-500002
فون: 24415194 - 040

اس شمارے میں

آپ کی بات ...... قارئین کے خطوط 2
ہماری بات ...... ادارہ 4

زبان اور تعلیم
● مردم شماری 2001 کی لسانی رپورٹ ...... عبدالباری مسعود 5
● اردو زبان کے عصری تقاضے — مسائل اور حل ...... ایس. ایم. رحمت اللہ 8
● نظم اور غزل کی تدریس ...... رشید احمد رشید تراپ 12

ادب اور ثقافت
● پریم چند کا ایک بھولا بسرا افسانہ — سودائے خام ...... پردیپ جین 17
● ہندوستان کے لوک گیتوں میں 1857 کی جھلکیاں ...... سید اطہر رضا بلگرامی 21
● گیانیشور لے کی نظمیں ...... سید محمد اشرف 25

سائنس، ٹیکنالوجی اور صحت
● خلائی سفر کے پچاس سال ...... اسعد فیصل فاروقی 29
● ہندوستانی کتب خانوں میں ڈیجی ٹائزیشن ...... فیصل مصطفیٰ 31
● غذائی بحران ...... شیوبیہ دیدی 34

کیریئر اور روزمرہ کے مسائل
● فورینسک سائنس میں روزگار کے مواقع ...... علی معصوم رضا 36
● کیا آپ کریڈٹ کارڈ کمپنیوں سے پریشان ہیں ...... محمد اعجاز 38

روبرو
● شہریار سے بات چیت ...... فرحان حنیف 39

ہماری مطبوعات سے
● غلام عباس کا افسانوی ادب ...... فضیل جعفری 42
● گیتا اور اس کی تعلیم ...... خواجہ دل محمد 48

اردو خبرنامہ ...... ادارہ 55

تبصرہ و تعارف
● آبشار اور آتش فشاں ...... جاوید رحمانی 73
● کلیات سراج اورنگ آبادی ...... عبدالرب ......
● پریم چند کا تنقیدی مطالعہ ...... سورج دیو سنگھ ......
● نغمۂ عرفان ...... مخمور سعیدی ......
● وحشت شناسی ...... درخشاں زریں ......
● بدچلن ...... عزیز احمد خاں ......

بچوں کا گوشہ
● بدی کا انجام ...... شرجیل احمد خاں 79

آپ کی بات

■ ابرار رحمانی، مدیر ماہنامہ یوجنا، یوجنا بھون پارلیمنٹ اسٹریٹ، نئی دہلی

ماہنامہ ''اردو دنیا'' کے اپریل کے شمارے میں ڈاکٹر پردیپ جین کا مضمون ''پریم چند کی ایک نایاب گم شدہ کہانی: آسمان کی پری'' شائع ہوئی ہے۔ یہ کہانی جیسی کہ جون کے ''اردو دنیا'' میں جین صاحب نے وضاحت کردی ہے ایک نایاب اور گم شدہ کہانی نہیں ہے۔ اس کی بازیافت آج سے پندرہ سال پہلے ہوچکی تھی اور یہ ماہنامہ ''آجکل'' کے نومبر 1993 کے شمارے میں شائع ہوچکی ہے۔ البتہ افسوس اس بات کا ہے کہ چوبیس ضخیم جلدوں میں مدن گوپال کی مرتب کردہ ''کلیات پریم چند'' اور ہندی میں بیس ضخیم جلدوں میں ایک ایڈیٹوریل بورڈ کی ادارت میں تیار ''پریم چندر چناولی'' میں ''آسمان کی پری'' شامل نہیں۔ مجلت، تساہل پسندی اور لاپرواہی کی یہ ایک دلیل ہے۔ ''آجکل'' جیسے مقبول عام رسالے میں شائع ہوئی اس کہانی تک مرتبین کی دسترس نہ ہونا افسوس ناک ہے۔

■ محمد شاہد، 18/259، دلا ماروڈ، مالیر کوٹلہ، پنجاب-1480243

''اردو دنیا'' مئی 2008 باصرہ نواز ہوا، شکریہ۔ رسالے کے مشمولات کو دیکھ کر مگا گر میں ساگر کی مثال یاد آتی ہے۔ ابتدا سے آخر تک سراپا انتخاب، حشو وزائد نہیں کے برابر۔ کس تحریر کی تعریف کی جائے کسے چھوڑا جائے۔ اس میں کوئی کلام نہیں کہ تمام گوشے بڑی محنت اور دقت نظر سے مرتب کیے گئے ہیں۔ ''زبان اور تعلیم'' کے تحت پیش کیا گیا مواد طلبہ، اساتذہ نیز عام دلچسپی رکھنے والے قارئین سب کے لیے مفید ثابت ہوگا۔ عارف وقار صاحب نے ایسے دلچسپ پیرائے میں مذکر ومؤنث کی بحث پیش کی کہ پڑھ کر لطف آگیا۔ انھوں نے بحث کا جو نتیجہ پیش کیا ہے وہ بہت مناسب ہے۔ یقیناً ''ہر زبان اپنے بولنے والوں کی لسانی اداؤں کے تابع ہوتی ہے اس لیے کوئی حتمی اصول وضع کرنا ممکن نہیں۔''

ندا فاضلی اور ابوبکر عباد کے دقیع مضامین بھی دامن دل کھینچتے ہیں۔ حسرت موہانی کی شاعری پر جیسی بحث اس مضمون میں کی گئی ہے اس سے حسرت کی شاعری کی کلید قاری کے ہاتھ میں آجاتی ہے۔ بلاشبہ یہ مضمون حسرت کی شاعری سے متعلق لکھے گئے کئی مقالات اور کتابوں پر بھاری ہے۔ ''کیرئیر'' سے متعلق مضامین بھی نہایت مفید ثابت ہوتے ہیں۔ دیگر گوشے بھی قابل داد ہیں۔ جناب یوسف ناظم کے انکشاف نے کالم ''آپ کی بات'' پر بھی توجہ مبذول کرائی۔ موصوف اپنے قول میں حق بجانب ہیں۔ ان کے خط کی شمولیت نے بھی اس حصے کو رونق بخشی ہے۔ آپ حضرات کی محنت سے رسالے نے جو منفرد مقام حاصل کیا ہے اس کے لیے مبارکباد قبول فرمائیں۔

■ ڈاکٹر شفیع ہدایت قریشی، تکیا محلہ، دتیا ایم۔ پی۔-475661

مئی 2008 کا ''اردو دنیا'' کا شمارہ زیر نظر ہے۔ اس موقر جریدے کے تمام مشمولات نہایت معلومات افزا ہوتے ہیں۔ اس شمارے میں جناب عارف وقار کا مضمون ''مذکر مؤنث کی کج ادائیاں'' پڑھ کر بہت مزہ آیا۔ ان کے پرلطف انداز تحریر سے پھوٹتے ظرافت اور لطیف طنز ومزاح کے اناروں نے دل ودماغ کے اندر تک ستارے برسا دیے۔

اس مضمون کے صفحہ 14 پر دوسرے پیراگراف میں آپ کے کمپوزر صاحب کی نظر پھسل کر اس پیراگراف کا خاصہ مواد چٹ کرگئی۔ سہواً، ہاں سہواً، عمداً نہیں۔ جی ہاں، تو اس پیراگراف کی چوتھی سطر میں ''گھڑی (بمعنی لمحہ)'' کے فوراً بعد کے الفاظ کئی سطروں تک چھوٹتے چلے گئے اور پھر اگلے پیراگراف کی کوئی سطر جڑ گئی جو یوں ہے ''لیکن بے چاری جمعرات تانیث کی چھری اوڑھے ایک کونے میں الگ کھڑی ہے۔''

آپ سے بہت معافی مانگتے ہوئے یہاں یہ عرض کرنے کی گستاخی کررہا ہوں کہ یہ پیراگراف یوں ختم ہوا ہوگا: ''گھڑی (بمعنی لمحہ) پر نظر پڑی تو معلوم ہوا کہ یہ گھڑی آتی ہے اور گزر جاتی ہے، دکھ کی گھڑی بہت مشکل سے کٹتی ہے، کبھی قیامت کی گھڑی بن جاتی ہے اسی لیے مؤنث کہلاتی ہے۔''

اس کے بعد اگلا پیراگراف یوں شروع ہوا ہوگا: ''دن اور ان کے ناموں پر تو یقیناً مذکر کا مردانہ لباس سجتا نظر آہی گیا تھا، جمعہ، سنیچر، اتوار، سوموار، منگل، بدھ سب کے سب مذکر بنے کھڑے تھے، افسوس لیکن بے چاری جمعرات تانیث کی چھری اوڑھے ایک کونے میں الگ کھڑی ہے۔''

میری اس جسارت کو اگر قابل سزا سمجھا جائے تو سر تسلیم خم ہے۔

ندا فاضلی کا باقر مہدی پر مضمون ان کے انداز تحریر کا بہترین نمونہ ہے۔

جناب ابوبکر عباد نے حسرت موہانی کو نہایت قابل قدر زاویے سے پرکھا ہے۔ ارجمند آرا نے بابا فرید گنج شکرؒ پر بہت عالمانہ مقالہ تحریر کیا ہے۔ مشمولہ تمام مواد کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔

■ بچل انصاری، صفدر وڈ، بلرام پور (یوپی)-271201

''اردو دنیا'' برابر مل رہا ہے۔ مطالعے سے اردو زبان و ادب کے بارے میں معلومات فراہم ہوتی ہیں جس کے لیے ممنون احسان ہوں۔ جون کا شمارہ سامنے ہے۔ جناب ہاشم قدوائی کا اردو رسم الخط کے بارے میں جو مشورہ ہے وہ نہایت ذی وقار انہ ہے۔ حضور والا میں کئی ادارے چلا رہا ہوں مگر

انٹر کالج، فیصل ڈگری کالج، بال بھارتی وغیرہ۔ چاہا تو یہی تھا کہ لڑکے اردو سیکھیں مگر عام طور پر مسلم بچے دلچسپی نہیں لیتے۔ اردو رسم الخط دینی مدرسوں تک محدود ہوتا جارہا ہے۔ اردو کے شاعر اکثر مشاعروں میں ہندی رسم الخط میں لکھوا کر لاتے ہیں اور اردو کے مجاہدوں میں نام لکھوا لیتے ہیں۔ آپ کے یہاں محترم محمور سعیدی بھائی موجود ہیں جنھیں ان تاجرانہ مشاعروں میں شعراء و شاعرات کی بھرمار کا اندازہ ہے۔ اس سے عوام تک زبان تو جاتی ہے مگر عوام رسم الخط اور تلفظ سے دور ہوتے جاتے ہیں۔ بیشتر اردو اکادمیاں جمود کے حوالے ہیں یا گروپ بندیوں کا شکار ہیں۔ مستحق لوگ گوشہ نشینی اختیار کرتے جاتے ہیں۔ برادرم چندر بھان خیال کا نامزد ہونا اردو کے حق میں فال نیک ہے خدا کرے وہ اس سلسلے میں کوئی کاوش کرسکیں۔ میں انھیں مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ انشاء اللہ دہلی جب کبھی آیا تو خدمت میں حاضری کا شرف حاصل کروں گا۔

■ ڈاکٹر سید احمد قادری، نیو کریم گنج، گیا-823001

''اردو دنیا'' اور ''فکر وتحقیق'' کو معیار کی جس بلندی پر آپ نے پہنچا دیا ہے، وہ یقینی طور پر آپ کی بے پناہ صلاحیتوں کا غماز ہے۔ ''فکر وتحقیق'' کا مخدوم محی الدین نمبر اس سلسلے کی ایک اہم کڑی ہے۔ اس نمبر کے تمام مشمولات، مواد اور معیار کے لحاظ سے بے حد اہم ہیں۔ ضرورت ہے، ایسی اہم ادبی شخصیات کے فکر وفن سے نئی نسل کو روشناس کرانے کی۔ اس شمارے میں لطف الرحمٰن، شمیم حنفی، شارب ردولوی، زبیر رضوی، سکندر احمد اور مجتبیٰ حسین کے مقالات بے حد قیمتی ہیں۔ اس نمبر کی ترتیب و اشاعت کے لیے مبارکباد قبول کریں۔

■ کیو.ایل.گوتم، گوتم مینشن، جنڈارہ، سونی پت-131001 (ہریانہ)

20 مارچ کے ہندوستان ٹائمس میں ایک اشتہار نظر سے گزرا ''قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان'' اس میں تو کوئی شک نہیں کہ پارٹیشن کے بعد اردو زبان کو سب سے زیادہ دھکا لگا ہے۔ کچھ غلط فہمیوں کی بنا پر اردو کو جو کہ ملک کی ایک جیتی زبان تھی، بری طرح سے پیچھے دھکیل دیا گیا۔ کون ذمے دار ہے؟ یہ تو ہسٹری ہے۔

میری عمر اس وقت 83 سال ہے۔ اردو کا شوق مجھ کو زندہ رہنے پر مجبور کررہا ہے۔ 20-25 سال پہلے میں نے بمبئی یونیورسٹی میں اردو M.A. میں داخلہ لے لیا تھا۔ میں کچھ عرصے کے لیے بمبئی سے باہر چلا گیا اور ڈیٹ نکل گئی۔ میں تمام تیاری کے باوجود امتحان نہ دے سکا۔ خیر۔

میرا خیال ہے کہ علی گڑھ سے M.A. سب سے مشکل ہے۔ میرٹھ اور دلی سے اس سے کچھ کم اور بمبئی سے سب سے آسان۔ نظیر اکبر آبادی اور غالب دو شاعر اور ان کی بھی کچھ چیدہ نظمیں اور غزلیں غرض یہ کہ بمبئی یونیورسٹی سے M.A. اردو کرنا سب سے آسان ہے۔ میری شاید قسمت میں ہی نہیں تھا۔

سونی پت میں ادبی سنگم کی نشست ہوتی ہے، ماہ بہ ماہ، لیکن آتش بہادل پوری اور تبسم آرا ناز جیسے شعرا کے گزرنے پر اب یہ جماعت ایسے لوگوں کے ہاتھوں میں چلی گئی ہے جن کا ادب سے کوئی خاص تعلق نہیں ہے۔ ہریانوی، اسرائیکی اور پتہ نہیں کیا کچھ اس میں ڈال دیا ہے۔ غرض یہ کہ میں نے وہ محفل چھوڑ ہی دی ہے۔ ''فکر وتحقیق'' اور ''اردو دنیا'' یہ دونوں رسالے مجھے بھیجنے کی تکلیف کریں بذریعہ وی پی صرف ایک سال کے لیے یا قیمت بتلائیں کہ میں چیک بھیج دوں کیونکہ زندگی کا کچھ بھروسہ نہیں ہے۔ لہٰذا میں صرف ایک سال کے لیے ہی یہ رسالے چاہتا ہوں۔ بھیجنے کا کشٹ کریں۔

■ عبدالوہاب انصاری، 69، مرزا غالب روڈ، الہ آباد (یوپی)

''اردو دنیا'' جون 2008 نظر نواز ہوا۔ اس میں ڈاکٹر علی جاوید نے عصمت چغتائی کے جس انٹرویو کو پیش کیا ہے وہ بہت خوبصورت ہے۔ اس شمارے کے خبرنامے میں مونگیر کے سیمینار کی روداد بھی بہت اچھی ہے۔ اس سے اندازہ ہوجاتا ہے کہ سیمینار کتنا معرکہ آرا ہوا ہوگا۔

اس شمارے میں مشکور معینی کا تبصرہ دیکھا۔ اس تبصرے میں مشکور معینی نے لکھا ہے ''اردو شاعری میں قصیدے کا آغاز بھی سودا نے کیا اور اسے عروج پر بھی انھی نے پہنچایا'' یہ میرے نزدیک ایک نیا انکشاف ہے اور ادبی تاریخ اس کی تائید نہیں کرتی۔ ارشاد عالم کا مضمون اردو ناول، انٹرنیٹ اور متوقع قاری بھی بہت معلومی ہے۔

□□□

یہ شمارہ پریس جارہا تھا تو اچانک مشہور مزاح گو شاعر ساغر خیامی اور ممتاز افسانہ نگار احمد یوسف کے انتقال کی خبر موصول ہوئی۔ ساغر خیامی پچھلے کچھ مہینوں سے علیل تھے اور ممبئی کے ایک اسپتال میں داخل تھے جہاں سے ان کا جسد خاکی تدفین کے لیے ان کے آبائی شہر لکھنؤ لے جائے جانے کی اطلاع ہے۔ احمد یوسف صاحب کا انتقال دل کا دورہ پڑنے سے ہوا۔ ہم مرحومین کی مغفرت اور ان کے پس ماندگان کے لیے صبر جمیل کی دعا کرتے ہیں۔

(ادارہ)

ہماری بات

بابائے قوم مہاتما گاندھی نے ہندوستان کی آزادی کی لڑائی عدم تشدد کے راستے پر چل کر لڑی۔ ہندوستان میں آزادی کے طلب گاروں میں وہ لوگ بھی شامل تھے جو سمجھتے تھے کہ غیر ملکی حاکموں کے خلاف پر امن جدوجہد کر کے آزادی حاصل نہیں کی جاسکتی، اس کے لیے متشددانہ طریقے اختیار کرنا ضروری ہی نہیں ناگزیر ہے۔ انھوں نے ایسا کیا بھی، انفرادی یا گروہی، دہشت گردانہ کارروائیوں کے علاوہ جو وقتاً فوقتاً کی جاتی رہیں، نیتاجی سبھاش چندر بوس نے گاندھی جی سے نظریاتی اختلافات کے نتیجے میں کانگریس سے ترک تعلق کے بعد مسلح جدوجہد کا راستہ ہی اختیار کیا اور آزاد ہند فوج کے نام سے ایک باقاعدہ فوج تیار کی۔ اس فوج نے بھی غیر ملکی حکومت کے لیے کافی پریشانیاں پیدا کیں۔ لیکن اندرون ملک آزادی کی تڑپ رکھنے والے عوام کی سرگرم شرکت اور بین الاقوامی سطح پر کچھ انگریز دشمن طاقتوں کی عملی تائید وحمایت کے باوجود نیتاجی اپنے مشن میں ناکام رہے اور بالآخر ملک گاندھی جی کے عدم تشدد کے اصولوں پر عمل کر کے آزادی حاصل کرنے میں کامیاب ہوا۔

آزادی ایک بڑی نعمت ہے جو کسی ملک کے باشندوں کو اپنی قسمت آپ بنانے کا موقع فراہم کرتی ہے اور انھیں یہ حق دیتی ہے کہ وہ اپنی پسند کا نظام اپنے ہاں قائم کریں جو انفرادی سطح پر بھی اور اجتماعی طور پر بھی عوام کی امنگوں کا آئینہ دار ہو۔ حصول آزادی کے بعد ہندوستان میں جو جمہوری نظام قائم ہوا وہ بھی ہندوستانی عوام کی امنگوں کا آئینہ دار تھا اور اس پر عوام کے منتخب نمائندوں کی مہر تصدیق ثبت تھی۔ ہندوستانی آئین میں ملک کے تمام شہریوں کو بنیادی حقوق کی ضمانت دی گئی ہے اور ان حقوق کے حصول کے طریقے بھی واضح کر دیے گئے ہیں۔

ہندوستان بہت بڑا ملک ہے اور یہاں کی آبادی بھی کثیر ہے جو مختلف قومیتوں، فرقوں اور طبقوں پر مشتمل ہے۔ ہر قومیت، فرقے اور طبقے کی ترجیحات جداگانہ ہیں اور سب اپنے اپنے نقطۂ نظر سے حالات کی سمت ورفتار طے کرنے کی خواہش رکھتے ہیں۔ یہ خواہش بے جا نہیں لیکن جب اس خواہش کی تکمیل کے لیے جمہوری طریقے اختیار نہ کر کے غیر جمہوری طریقے اختیار کیے جائیں اور گروہی مفاد کے لیے قومی مفاد کو بالاے طاق رکھ دیا جائے تو یہ ان حدود سے تجاوز ہوگا جن کی پاسداری ذمے دار شہریوں پر لازم ہے۔

آزادی کے وقت بہت سے فرقے ایسے تھے جو معاشی اعتبار سے بھی اور تعلیمی اعتبار سے بھی پس ماندہ تھے۔ ان کی پس ماندگی دور کرنے کے لیے سرکاری دفتروں میں بھی اور تعلیمی اداروں میں بھی ان کے لیے کچھ نشستیں مخصوص کر دی گئیں۔ یہ ایک اچھا قدم تھا اور اس سے پس ماندہ فرقوں کے لاکھوں افراد کو فائدہ پہنچا۔ یہ ایک عارضی انتظام تھا لیکن سیاسی مصلحتوں کے تحت اسے طول دیا جاتا رہا اور پھر یہ ہوا کہ جو فرقے اولاً پس ماندہ قرار نہیں دیے گئے تھے، وہ بھی اپنی پس ماندگی کے دعوے پیش کرنے لگے تاکہ وہ بھی ریزرویشن کی سہولتوں سے فائدہ اٹھا سکیں۔ سیاسی مصلحتوں کے تحت ہی یہ دعوے قبول بھی کیے جاتے رہے اور کسی مرحلے پر اگر حکومت وقت نے انھیں قبول کرنے سے انکار کر دیا تو حزب مخالف کی جماعتیں اپنی سیاسی مقبولیت بڑھانے کے لیے ان کی تائید میں اٹھ کھڑی ہوئیں۔ حالانکہ سیاسی جماعتوں کی نظر ملک وقوم کے وسیع تر مفادات پر ہونی چاہیے۔

زیادہ تشویشناک بات یہ ہے کہ حصولِ مراعات کی یہ کوششیں اکثر متشددانہ تحریکوں کی صورت اختیار کر لیتی ہیں جس سے نہ صرف عام زندگی پر ناگوار اثرات مرتب ہوتے ہیں بلکہ ملک کے معاشی اور اقتصادی مفادات بھی بری طرح متاثر ہوتے ہیں۔ نجی اور قومی جائدادوں کو تباہ وبرباد کیا جاتا ہے۔ گاڑیاں جلائی جاتی ہیں، ریلوں کی پٹریاں اکھاڑ دی جاتی ہیں، راستے بند کر دیے جاتے ہیں اور کبھی کبھی لوٹ مار کا بازار بھی گرم ہو جاتا ہے۔ یہ ساری کارروائیاں جمہوریت کی جڑوں پر کلہاڑا چلانے کے مترادف ہیں۔

اگر ہمیں اپنے مطالبات کے حق بجانب ہونے کا یقین ہے تو ان کی تکمیل کے لیے وہی راستہ اختیار کرنا چاہیے جو ہمارے سیاسی اکابرین خصوصاً گاندھی جی نے ہمیں دکھایا ہے یعنی پُر امن جدوجہد۔ گاندھی جی اور ان کے پیروکاروں کا مقابلہ ایک غیر ملکی طاقت سے تھا جو بہ جبر ہم پر حکومت کر رہی تھی، تب بھی انھوں نے تخریب وتشدد کو روا نہ رکھا۔ ہمارا معاملہ خود اپنی منتخب کردہ حکومتوں سے ہے جو ہماری بات سننے کے لیے ہمہ وقت تیار ہیں۔ ان تک اپنی بات پہنچانے کے لیے ہمیں ہنگامہ آرائی کرنے یا تخریب وتشدد کے ہتھکنڈے آزمانے کی کیا ضرورت ہے۔

ایک آزاد اور خود مختار ملک کے شہری کی حیثیت سے ہمیں جو حقوق ملے ہوئے ہیں، ان کا استعمال ہمیں ضرور کرنا چاہیے لیکن ان فرائض کو بھی سمجھنا اور نبھانا چاہیے جو ملک کا جمہوری آئین ہم پر عائد کرتا ہے۔ محض حقوق کا واویلا مچانا اور فرائض کو نظر انداز کر دینا یہ ایک ایسا طرز عمل ہے جو اپنا کوئی جواز نہیں رکھتا۔

□□□

عبدالباری مسعود

مردم شماری 2001 کی لسانی رپورٹ

مردم شماری (2001) کی تازہ رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ اردو بولنے والوں کی تعداد بڑھ رہی ہے۔ اب پورے ملک میں اردو آبادی کی تعداد پانچ کروڑ 15 لاکھ 36 ہزار ایک سو گیارہ ہوگئی ہے۔ بفرض محال اردو کو ایک مخصوص مذہبی گروہ سے وابستہ کردیا جائے (جیسا کہ عملاً کردیا گیا ہے) اور اس فرقے کی مردم شماری کے مطابق آبادی کے حوالے سے دیکھا جائے تب بھی یہ تعداد کم از کم دوگنی سے زیادہ ہونی چاہیے۔ لیکن ہر مردم شماری پر ایسے ہی اعداد و شمار پیش کیے جاتے رہے ہیں اور تعجب خیز امر یہ ہے کہ اردو حلقوں اور اردو کا دم بھرنے والوں نے کبھی ان اعداد و شمار کی صداقت پر سوالیہ نشان نہیں لگایا اور نہ ہی یہ پوچھا کہ اس کی کیا بنیاد ہے اور یہ سراسر دھاندلی کس سطح پر ہوتی ہے؟

2001 کی مردم شماری کے حوالے سے زبانوں کے متعلق جو رپورٹ جاری ہوئی ہے اس کے مطابق ہندوستان میں مسلمہ 22 زبانیں بولنے والوں کی آبادی میں اہل اردو کا مقام چھٹا ہے۔ ہندی کو بدستور اول مقام حاصل ہے جب کہ بنگالی دوسرے اور تیلگو زبان تیسرے نمبر پر ہے جن کے بولنے والوں کی تعداد بالترتیب آٹھ کروڑ 34 لاکھ اور سات کروڑ 40 لاکھ ہے۔ مرہٹی اور تمل زبانیں چوتھے اور پانچویں مقام پر جب کہ گجراتی (چار کروڑ 60 لاکھ) کنڑ تین کروڑ 79 لاکھ) ملیالم (تین کروڑ 39 لاکھ) اڑیہ تین کروڑ 30 لاکھ) اور پنجابی (دو کروڑ 86 لاکھ بتائی گئی ہے۔ اس میں مذہبی حوالے سے ہندوؤں کی تعداد 82 کروڑ 75 لاکھ، مسلمانوں کی 13 کروڑ 80 لاکھ 19 ہزار، عیسائیوں کی دو کروڑ 40 لاکھ اور سکھوں کی ایک کروڑ 92 لاکھ درج کی گئی ہے۔

زبان کے حوالے سے مردم شماری کمشنر نے 2001 کی مردم شماری کی بنیاد پر جو رپورٹ جاری کی ہے، اس کے مطابق ہندی بولنے والوں کی تعداد 42 کروڑ، 20 لاکھ 48 ہزار ہے۔ ان میں بھوجپوری بولنے والے (3.30 کروڑ)، چھتیس گڑھی بولنے والے (1.82 کروڑ)، راجستھانی بولنے والے (1.47 کروڑ) بھی شامل ہیں۔ اردو بولنے والوں کی تعداد میں بھی 21 لاکھ افراد کی زبان اردو آمیز زبان بتائی گئی ہے جو ایک انکشاف سے کم نہیں ہے۔ اس سے قبل 1991 کی مردم شماری میں اردو بولنے والوں کی تعداد چار کروڑ 34 لاکھ سے زائد تھی اب تازہ لسانی رپورٹ کی روشنی میں اس تعداد میں 81 لاکھ نئے اردو بولنے والوں کا اضافہ ہوا ہے۔ اردو کے بارے میں یہ اعداد و شمار کتنے مستند اور مبنی بر حقائق ہیں، اس کا جائزہ ہم یہاں لینے کی کوشش کریں گے۔

اس امر میں اب کوئی تردد باقی نہیں رہ گیا کہ اردو کو مسلمانوں سے وابستہ کردیا گیا ہے۔ اگر مختلف ریاستوں میں مسلم آبادی کے تناسب کو اس کا پیمانہ بنایا جائے تو اردو کے متعلق یہ اعداد و شمار غلط ثابت ہوتے ہیں۔ سب سے پہلے آبادی کے اعتبار سے ملک کی سب سے بڑی ریاست اتر پردیش کو لیں جو اردو کا گہوارہ رہی ہے، جس کی مجموعی آبادی (بشمول اتراکھنڈ) 17 کروڑ 40 لاکھ 60 ہزار میں مسلمانوں کی تعداد تین کروڑ 10 لاکھ 75 ہزار ہے۔ ریاست کے مسلمانوں کی مادری زبان اردو کے سوا کوئی اور نہیں ہے۔ ریاست آزادی سے قبل بھی اور بعد میں بھی اردو مخالف قوتوں کی سب سے بڑی آماجگاہ رہی ہے چنانچہ یہاں اپنی مادری زبان کے تئیں لوگوں کا حساس ہونا فطری امر ہے۔ ریاست میں اردو بولنے والوں کی تعداد اس وقت بھی اکثریت میں تھی جب اردو مخالف تحریک اپنی انتہا پر تھی۔ اسی دوران آزادی کے فوری بعد اردو کا تعلیم سے رشتہ بیک جنبش قلم کاٹ دیا گیا تھا۔ اس وقت ریاست کے 56 فی صد لوگوں کی اکثریت کا ذریعہ تعلیم اردو زبان تھی۔ اب اردو بولنے والوں کی تعداد جو پانچ کروڑ بتائی گئی ہے وہ یوپی کے حوالے سے دیکھی جائے تو صحیح نہیں معلوم ہوتی کیونکہ اکیلے یوپی میں تین کروڑ سے زائد مسلمان آباد ہیں اور یہ کسی بھی ریاست میں آباد مسلمانوں کی سب سے بڑی آبادی ہے۔

مسلم آبادی کے لحاظ سے دوسری بڑی ریاست مغربی بنگال ہے۔ وہاں کی آٹھ کروڑ 18 لاکھ کی آبادی میں مسلمانوں کی تعداد دو کروڑ 24 لاکھ ہے۔ ریاست میں مسلمان ذو لسانی حیثیت رکھتے ہیں۔ ریاست کی سرکاری زبان بنگالی بولنے والے مسلمانوں کی تعداد نصف سے زیادہ ہے۔ تقریباً ایک کروڑ مسلمانوں کی مادری زبان اردو ہے۔ بحیثیت مادری زبان یوپی اور مغربی بنگال میں اردو بولنے والوں کی تعداد چار کروڑ ہو جاتی ہے۔

تیسری بڑی ریاست بہار ہے جس میں جھارکھنڈ کو شامل کرکے اعداد و شمار کو دیکھیں تو تصویر مزید صاف ہو جاتی ہے۔ ان دونوں ریاستوں کی مجموعی آبادی تقریباً 11 کروڑ ہے جہاں سرکاری طور پر مسلم آبادی کا تناسب 16 فی صد یعنی ایک کروڑ 71 لاکھ ہے۔ یہاں بھی مسلمانوں کی مادری زبان اردو کے سوا کوئی اور زبان نہیں ہے۔ اب اس تعداد کو مذکورہ دونوں ریاستوں کی تعداد

میں شامل کرلیا جائے تو یہ تین ریاستیں ہی پانچ کروڑ کا نشانہ پورا کرلیتی ہیں۔

مہاراشٹر کی تقریباً نو کروڑ 61 لاکھ آبادی میں مسلمانوں کی تعداد ایک کروڑ دو لاکھ 70 ہزار ہے۔ ریاست میں مراٹھی سب سے بڑی زبان ہے اس کے بعد اردو کا مقام ہے۔ گجراتی اور کوکنی بولنے والوں کی بھی ایک قابل ذکر تعداد ہے۔ تاہم مسلمانوں کی نوے فی صد آبادی کی مادری زبان اردو ہے۔ ہمسایہ ریاست آندھراپردیش کی سات کروڑ 60 لاکھ آبادی میں مسلمانوں کی آبادی تقریباً 61 لاکھ ہے۔ مردم شماری رپورٹ میں وہاں تیلگو بولنے والوں کی تعداد سات کروڑ چار لاکھ بتائی گئی ہے اس میں کرناٹک اور تمل ناڈو میں آباد تیلگو بولنے والوں کی تعداد بھی شامل کی گئی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ریاست کے آندھرا علاقے میں مسلم آبادی کا ایک چھوٹا طبقہ تیلگو بولتا ہے لیکن اس کی اکثریت کی مادری زبان اردو ہے جن کی تعداد 50 لاکھ سے کم نہیں ہوگی۔ دوسری ہمسایہ ریاست کرناٹک کی مجموعی آبادی پانچ کروڑ 20 لاکھ میں مسلم آبادی تقریباً 61 لاکھ ہے جس میں کنڑ بولنے والوں کی تعداد تین کروڑ 79 لاکھ سے زیادہ ہے۔ جہاں ساحلی پٹی میں آباد مسلمان کنڑ یا مقامی زبان بولتے ہیں۔ لیکن یہاں بھی اردو بولنے والوں کی تعداد اندازاً 50 لاکھ سے اوپر ہوگی۔

تمل ناڈو کی چھ کروڑ 20 لاکھ آبادی میں تمل بولنے والوں کی اکثریت ہے جہاں مسلمانوں کی تعداد تقریباً 35 لاکھ ہے۔ وانمباڑی اور مدراس کے چند علاقوں کو چھوڑ کر مسلمانوں کی اکثریت تمل بولتی ہے۔ پھر بھی ریاست میں اردو بولنے والوں کی تعداد اندازاً 10 لاکھ ہوگی۔ جب کہ ہمسایہ ریاست کیرالا کی تین کروڑ سے زائد آبادی میں مسلمانوں کی تعداد 70 لاکھ سے زیادہ ہے تاہم یہاں کی پوری مسلم آبادی کی مادری زبان ملیالم ہے۔ یعنی جنوب کی چار بڑی ریاستوں میں اردو بحیثیت مادری زبان بولنے والوں کی تعداد ایک کروڑ 10 لاکھ سے زیادہ ہوگی۔ وہیں مہاراشٹر میں یہ تعداد تقریباً 90 لاکھ ہوگی۔

اب شمال کی دیگر ریاستوں، مدھیہ پردیش، راجستھان، ہریانہ، چھتیس گڑھ اور دہلی کا جائزہ لیا جائے تو اردو بولنے والوں کی تعداد مردم شماری کی تعداد سے دوگنی سے زیادہ ہوجائے گی۔ مدھیہ پردیش اور چھتیس گڑھ دونوں ریاستوں کی مجموعی آبادی آٹھ کروڑ سے زائد ہے جس میں مسلم آبادی کا تناسب پانچ فی صد سے زیادہ ہے یعنی 45 لاکھ ہے۔ یہاں تقریباً تمام مسلم آبادی کی مادری زبان اردو ہے۔ راجستھان کی پانچ کروڑ 60 لاکھ آبادی میں تقریباً 50 لاکھ مسلمان ہیں اور یہاں بھی مسلمانوں کی نوے فیصد آبادی کی مادری زبان اردو ہے۔ گو ریاست کے کچھ سرحدی علاقوں جیسے باڑمیر اور جیسلمیر وغیرہ میں مسلمان وہاں کی مقامی زبان بولتے ہیں لیکن ریاست میں مسلمانوں کی اکثریت اردو بولنے والوں کی ہے۔ ہریانہ میں گو مسلمانوں کی آبادی کچھ قابل ذکر نہیں ہے پھر بھی میوات اور اتر پردیش سے متصل اضلاع میں اردو بولنے والوں کی آبادی رہتی ہے۔ ریاست کی دو کروڑ آبادی میں مسلمانوں کی تعداد 12 لاکھ سے زائد ہے اسی طرح دہلی کی ایک کروڑ 30 لاکھ آبادی میں مسلمانوں کی تعداد 16 لاکھ سے زیادہ ہے جسے مکمل طور پر اردو کا لسانی گروہ کہا جاسکتا ہے۔ یہاں کچھ غیر مسلم بھی اپنا رشتہ اردو سے جوڑتے ہیں چنانچہ یہاں اردو بولنے والوں کی تعداد 16,17 لاکھ سے زیادہ ہوگی۔

شمالی مشرقی ریاستوں میں مختلف علاقائی زبانیں بولی جاتی ہیں اور سوائے آسام اور منی پور کے ان ریاستوں میں کوئی قابل ذکر مسلم آبادی نہیں ہے۔ آسام کی دو کروڑ 67 لاکھ آبادی میں مسلمانوں کی تعداد 80 لاکھ سے زیادہ ہے لیکن ان کی بڑی اکثریت یا تو آسامی یا بنگالی بولتی ہے۔ اسی طرح منی پور میں بھی مسلمان منی پوری زبان بولتے ہیں۔

ملک کی واحد ریاست جہاں اردو کو سرکاری زبان کی حیثیت حاصل ہے وہ جموں وکشمیر ہے جس کی ایک کروڑ سے زائد آبادی میں 55 لاکھ کشمیری بولنے والے ہیں۔ جموں اور لداخ کے علاقوں میں اردو بحیثیت مادری زبان بولنے والوں کی ایک اچھی خاصی تعداد موجود ہے۔ ملک کے طول وعرض میں اردو بولنے والوں کی مسلم آبادی کے حوالے سے بات کی جائے تو ان کی تعداد مردم شماری رپورٹ میں پیش کردہ تعداد سے دوگنی ہی نکلے گی اور ملک کی 22 مسلمہ زبانوں میں اس کا مقام چھٹا نہیں دوسرا ہوگا۔ لیکن آج تک یہ بات ناقابل فہم بنی ہوئی ہے کہ اردو بولنے والوں کی اصل تعداد کیوں نہیں بتائی جاتی ہے؟ آئین کی روشنی میں اپنی اصلی مادری زبان کے بجائے کسی اور زبان کو مادری زبان قرار دینے کی صورت میں کوئی خاص رعایت یا فائدہ تو نہیں مل سکتا ہے پھر اردو بولنے والا کیوں دوسری زبان کو اپنی مادری زبان قرار دے گا۔

ایک اور زاویے سے نظر ڈالی جائے تو اس شبہ کو مزید تقویت ملتی ہے۔ ہندی بولنے والی آٹھ ریاستوں اتر پردیش، اتراکھنڈ، بہار، جھارکھنڈ، راجستھان، مدھیہ پردیش، چھتیس گڑھ اور ہریانہ کی مجموعی آبادی 45 کروڑ 80 لاکھ ہے جس میں مسلم آبادی کا تناسب تقریباً 14 فی صد ہے یعنی یہ تعداد چھ کروڑ 30 لاکھ ہے۔ ان ریاستوں میں ہندی بولنے والوں کی تعداد 42 کروڑ 21 لاکھ دکھائی گئی ہے۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ مسلمانوں کی تقریباً نصف آبادی کو ''ہندی کے زمرے'' میں شامل کردیا گیا ہوگا۔

اس امر میں کوئی کلام نہیں کہ فرقہ وارانہ سیاست کا سب سے زیادہ نقصان جس زبان کو پہنچا وہ اردو ہی ہے۔ آزادی سے قبل ملک کے رابطے کی اور سرکاری زبان کا درجہ رکھنے والی یہ زبان آج بھی اپنے جائز مقام سے محروم ہے۔ بڑی جدوجہد کے بعد آج چند ریاستوں میں جیسے بہار، جھارکھنڈ

آندھراپردیش اور دہلی میں اردو کو چند امور کے لیے دوسری سرکاری زبان کا درجہ ملا ہوا ہے جب کہ یوپی میں اسے منصوبہ بند طریقے سے ختم کرنے کی کوشش ابتدا سے جاری ہے۔ جب یوپی میں بھی اسے دوسری سرکاری زبان کا درجہ دیا گیا تو اس کے خلاف ایک طوفان کھڑا کر دیا گیا تھا، یہ معاملہ آج بھی عدالت میں چل رہا ہے۔ آج صورت حال یہ ہے کہ اردو ذریعۂ تعلیم کا یوپی میں کوئی انتظام ہے ہی نہیں۔

1971 کی مردم شماری میں اردو بولنے والوں کی تعداد دو کروڑ 86 لاکھ 21 ہزار پیش کی گئی تھی اب 2001 میں یہ تعداد تقریباً دوگنی ہوگئی ہے لیکن یہ بھی اصل تعداد کی عکاسی نہیں کرتی۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ غالباً آج تک کسی اردو ادارے یا تنظیم نے ان اعداد و شمار کو چیلنج نہیں کیا کہ اس کی کیا بنیادیں ہیں؟ کیا مسلمانوں کی سرکاری طور پر بتائی گئی 15 کروڑ آبادی میں دو تہائی آبادی (تقریباً 10 کروڑ) کی مادری زبان اردو کے علاوہ کوئی اور زبان ہوسکتی ہے؟ لسانیات کی یہ بات بھی صحیح ہے کہ زبانوں کا کوئی مذہب نہیں ہوتا۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ غیر منقسم ہندوستان میں مسلم آبادی کا سب سے بڑا لسانی گروہ بنگالی مسلمان تھے۔ انگریز افسر گریرسن کی قیادت میں متحدہ ہندوستان کا پہلی مرتبہ جو لسانی سروے کیا گیا تھا اس کے مطابق اس وقت ہندوستان میں 179 زبانیں اور 544 بولیاں پائی گئی تھیں۔ موجودہ مردم شماری 2001 میں مجموعی طور پر 122 زبانوں کا جائزہ لیا گیا ہے جس میں آئین کے آٹھویں شیڈول کے تحت 22 مسلمہ زبانیں شامل ہیں، جن کے بولنے والوں کی کل تعداد 96.56 فیصد ہے۔ جب اردو کو مسلمانوں سے وابستہ کر دیا گیا ہے تو اس کے بولنے والوں کی اصل تعداد بتانے میں یہ رازداری کیوں؟

□□□

ملک کی بیشتر ریاستوں میں اردو بولنے والوں کی اندازاً تعداد کا مسلم آبادی کے حوالے سے گوشوارہ

اردو بولنے والوں کی سرکاری تعداد بمطابق 2001، (51.536 ملین) 5 کروڑ 15 لاکھ 36 ہزار ایک سو گیارہ

ہندوستان/ریاست	مجموعی آبادی 2001 کے مطابق	مسلم آبادی (ملین/دس لاکھ)	مسلم آبادی کا تناسب	اردو بولنے والوں کی اندازاً تعداد بمطابق 2001
ہندوستان	1028.61	138.19	13.4	51.536% ملین
اتر پردیش واتراکھنڈ	17.69	31.75	18.4	تین کروڑ سے زیادہ
بہار و جھارکھنڈ	109.94	17.45	15.45	ایک کروڑ 70 لاکھ
مہاراشٹر	96.88	10.27	10.6	تقریباً 90 لاکھ
مغربی بنگال	80.18	20.24	25.24	تقریباً ایک کروڑ
آندھراپردیش	76.21	06.99	9.2	تقریباً 50 لاکھ
کرناٹک	52.85	06.46	12.2	تقریباً 55 لاکھ
مدھیہ پردیش، وچھتیس گڑھ	81.18	04.25	5.2	تقریباً 40 لاکھ
راجستھان	56.51	04.79	8.5	تقریباً 40 لاکھ
تمل ناڈو	62.41	03.47	5.6	تقریباً 10 لاکھ
دہلی	13.85	01.67	11.7	تقریباً 16 لاکھ
گجرات	50.67	04.59	9.1	تقریباً 20 لاکھ
ہریانہ	21.14	1.22	5.8	تقریباً 10 لاکھ
میزان		93.24		نو کروڑ 10 لاکھ

پتہ:
Flat No. 9, 3rd Floor, Hamdard Officers Flats (Jha House), Adjacent Ghalib Academy,
Hzt Nizamuddin (West), New Delhi-110013

ایس.ایم.رحمت اللہ

اردو زبان کے عصری تقاضے — مسائل اور حل

کسی بھی زبان کا وجود انسان کی ضروریات زندگی کی تکمیل کے لیے عمل میں آتا ہے۔ علاوہ ازیں اگر زبان کو پاسبانوں کا ساتھ اور سرکاری سرپرستی حاصل ہو جائے تو وہ مخالفین کی لاکھ کوششوں کے باوجود بھی نشو نما پاتی اور قوم کی تعمیر و ترقی میں اہم رول ادا کرتی رہتی ہے۔ زبان اردو کی داستان بھی کچھ اسی طرح کی ہے۔ عہد وسطیٰ میں ہند اور آریائی زبانوں کی آمیزش کی بدولت ہندوستان میں ایک لشکری زبان نے جنم لیا جس کو دنیا میں آج اردو کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اس طرح اردو زبان جو سرزمین ہند پر پیدا ہوئی رفتہ رفتہ ترقی کرتے ہوئے مغلیہ دور میں اپنے عروج پر کھڑی ہوئی اور ملک کے مختلف علاقوں میں ذریعۂ تعلیم کا شرف حاصل کرنے کے علاوہ حیدرآباد دکن میں سرکاری زبان بننے کا اعزاز بھی حاصل کی۔ حیدرآباد دکن میں میڈیسن کی تعلیم بھی زبان اردو میں ہوا کرتی تھی۔ نیز اس زبان نے بتدریج علاقائی سرحدوں کو پار کرتے ہوئے دنیا کے بیشتر ملکوں میں بھی اپنی پہچان بنائی۔ تاہم حصول آزادی کے بعد ہمارے ملک میں اردو اس کی اپنی جنم بھومی پر ہی بلی کا بکرا بنی۔ تاریخی اعتبار سے دہلی، لکھنؤ اور حیدرآباد ہندوستان میں اردو زبان و ادب کے گہوارے تصور کیے جاتے ہیں۔ تاہم شمالی ہند میں ہندی کے غلبہ کی وجہ سے اردو تعلیمی میدان میں تقریباً ختم ہو چکی ہے اور اگر دینی مدارس نہ ہوتے تو غالباً اس کی شمع گل ہو ہی جاتی۔ نیز جنوبی ہند میں بھی اس کی جڑیں کمزور ہوتی جارہی ہیں۔ مزید یہ کہ ہندوستان کی بعض ریاستوں میں اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ عطا کیا گیا لیکن اس ضمن میں کوئی خصوص کارروائی نہیں کی گئی۔ اس پس منظر میں اردو کی ترقی و ترویج کو یقینی بنانے کے لیے اگر مخصوص قدم نہیں اٹھائے جائیں تو اردو زبان کا گلستاں جو کہ پہلے سے ہی کافی حد تک اُجڑ چکا ہے نیست و نابود ہو جائے گا۔

فروغ اردو سے متعلق منعقد کیے جانے والے سیمیناروں اور مذاکروں میں عموماً اردو ادب کے مختلف پہلوؤں سے متعلق بات کی جاتی ہے اور اردو زبان کے تقاضوں اور مسائل کی جانب توجہ نہیں دی جاتی۔ اردو زبان کے مسائل کی یکسوئی میں ہی اردو ادب کی ترقی کا راز مضمر ہے۔ لہٰذا اس مقالے میں فروغ اردو کے لیے ''اردو زبان کے عصری تقاضے — مسائل اور حل'' سے بحث کی جارہی ہے۔

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ کسی بھی زبان کو زندہ رکھنے اور اس کی ترقی کو یقینی بنانے کے لیے اس زبان کا بحیثیت ذریعۂ تعلیم برقرار رہنا نہایت ہی ضروری ہے۔ مزید یہ کہ اگر کوئی زبان ذریعۂ تعلیم کی حیثیت سے ترقی پاتی ہے تو وہ لازماً ایک نہ ایک دن سرکاری زبان یا دوسری سرکاری زبان کا درجہ حاصل کرتی ہے۔ تاہم ذریعۂ تعلیم اور سرکاری زبان کی حیثیت سے برقرار رہنے کے لیے کسی بھی زبان کو عصری تقاضوں سے ہم آہنگ ہونا پڑتا ہے اور کوئی بھی زبان عصری تقاضوں سے اسی وقت ہم آہنگ ہوتی ہے جب کہ اس کے مسائل کی نشاندہی کی جاتی ہے اور ان کو حل کیا جاتا ہے۔

ہم اس امر سے بخوبی واقف ہیں کہ ہندوستان کے اکثر علاقوں میں اردو زبان کو ذریعۂ تعلیم اور ہندوستان کی بعض ریاستوں میں دوسری سرکاری زبان کا موقف حاصل ہے۔ نیز اردو کشمیر میں سرکاری زبان کی حیثیت رکھتی ہے۔ لہٰذا اُس کے عصری تقاضوں کا تعلق بھی اردو بحیثیت ذریعۂ تعلیم اور اردو بحیثیت سرکاری زبان سے ہے۔ اردو زبان کی ترقی و ترویج کے لیے اس کے عصری تقاضوں کی تکمیل کرنا اور اس کا رعظیم کے لیے اُن سے جڑے ہوئے مسائل کو حل کرنا اشد ضروری ہے۔ مزید یہ کہ چونکہ اردو کی بقا کے لیے اردو رسم الخط کا تحفظ لازمی ہے اور اردو کی ترقی و ترویج کی ذمے داری غیروں سے زیادہ اپنوں پر ہی رہتی ہے لہٰذا ان پہلوؤں کو بھی اردو زبان کے عصری تقاضوں میں شامل کرتے ہوئے مضمون کے آخری حصے میں ان تقاضوں سے متعلق مسائل اور اُن کے حل پر بھی بحث کی گئی ہے۔

مذکورہ حقیقت کے پیش نظر زیر نظر مضمون میں اردو کے عصری تقاضوں کی نشاندہی کرتے ہوئے ان کی تکمیل کے لیے جن عملی اقدامات کی ضرورت لاحق ہے اُن کو کچھ اس طرح سے پیش کیا گیا ہے کہ اس سے اردو زبان کے مسائل اور ان کے حل بھی واضح ہو جاتے ہیں۔

اب ہم اردو کے اُن عصری تقاضوں کی طرف توجہ مبذول کریں گے جو کہ ''اردو بحیثیت ذریعۂ تعلیم'' سے جڑے ہیں۔ اردو کو بحیثیت ذریعۂ تعلیم زندہ رکھنا' اُس کو ترقی دینا' اُس کے معیار کو یقینی بنانا اور اردو کو روزگار و تحقیق سے جوڑنا اردو زبان کے ایسے عصری تقاضے ہیں جن کا تعلق اردو بحیثیت ذریعۂ تعلیم سے ہے۔ ان تقاضوں کی تکمیل کے لیے حکومتوں کی جانب سے حسب ذیل عملی اقدامات ناگزیر ہیں:

☆ اردو طبقہ کے علاقوں میں اردو ذریعۂ تعلیم کے مدارس اور کالجوں کا قیام

عمل میں لائیں اور قابل اساتذہ کا تقرر کریں کیونکہ اردو کے فروغ کے لیے اردو زبان کی تدریس کا معقول بندوبست ہونا اور اساتذۂ اردو کا بھی لگن اور محنت سے اپنے فرائض انجام دینا نہایت ہی ضروری ہے۔ واضح رہے کہ سچر کمیٹی نے بھی مسلمانوں کی تعلیمی پستی کا انکشاف کرتے ہوئے مسلم علاقوں میں زیادہ سے زیادہ تعلیمی ادارے قائم کرنے کی پرزور وکالت کی ہے۔

☆ فروغِ اردو کے لیے ہر ریاست میں اردو ذریعۂ تعلیم کے زیادہ سے زیادہ رہائشی مدارس قائم کیے جائیں۔ یہ مدارس یقیناً اردو ذریعۂ تعلیم کی ترقی و ترویج میں ممد و معاون ثابت ہوں گے۔

☆ اردو مدارس اور کالجوں میں مستقل بنیاد پر ہر مضمون کے اساتذہ اور لکچروں کا تقرر عمل میں لائیں۔ واضح رہے کہ غیر مستقل بنیاد پر اساتذہ کے تقررات کی صورت میں تعلیمی سرگرمیاں مؤثر طور پر انجام نہیں پاتیں۔

☆ مقامی و انگریزی ذریعۂ تعلیم کے تمام خانگی امدادی و سرکاری مدارس اور کالجوں میں اردو کو بطور اختیاری مضمون رائج کیا جائے تاکہ اردو مادری زبان کے طالب علموں کو بھی اردو پڑھنے و سیکھنے کا موقع ملے۔ اس کی بدولت اردو ذریعۂ تعلیم کی ترقی کے اسباب پیدا ہو سکتے ہیں۔

☆ اردو ذریعۂ تعلیم کے فروغ کے لیے طلبہ اور طالبات کو مختلف نوعیت کی ترغیبی مراعات اور اسکالرشپس فراہم کیے جائیں۔

☆ اردو ذریعۂ تعلیم کے ٹیچروں اور لکچروں کو متعلقہ مضامین کی جدید معلومات سے آراستہ کرنے اور درس و تدریس کے جدید طریقہ ہائے کار سے واقف کرانے اور ان کے ذریعے اردو ذریعۂ تعلیم کے معیار کو بلند اور مؤثر بنانے کے لئے وقتاً فوقتاً Orientation and Refresher Courses کے انعقاد کا پابندی سے اہتمام کیا جائے اور تمام اساتذہ کے لیے کمپیوٹر اور انٹرنیٹ کی سہولت مہیا کی جائے۔

☆ ادارۂ ادبیات اردو اور دیگر ادارہ جات کے زیر اہتمام منعقد کیے جانے والے اردو فاضل، اردو کامل اور دیگر کورسوں میں معیار کو یقینی بنانے کے اقدامات کیے جائیں اور ان کورسوں کو ان کے نصاب کے پیش نظر انٹرمیڈیٹ اور گریجویشن کے مماثل کا درجہ عطا کیا جائے۔ یہ اقدام اردو کو تعلیمی میدان میں بحیثیت ذریعۂ تعلیم زندہ رکھنے کے لیے ثمر آور ثابت ہوں گے۔

☆ مقررہ تعداد میں طلبہ کی عدم دستیابی کی وجہ سے اردو ذریعۂ تعلیم کے مدارس، جونیئر و ڈگری کالجوں کو معدوم ہونے سے روکنے کے لیے ان مدارس و کالجوں کو طلبہ کی قلیل ترین تعداد کے لزوم سے مستثنیٰ قرار دیا جائے۔ اردو ذریعۂ تعلیم کی بقا کے لیے یہ اقدام نہایت ہی ضروری ہے۔

☆ مخلوعہ سرکاری جائیدادوں کو پُر کرنے کے لیے پبلک سروس کمیشن اور دیگر ادارہ جات کی جانب سے منعقد کیے جانے والے امتحانات کے پرچہ جات اردو میں بھی تیار کئے جائیں اور ان امتحانات میں شریک ہونے والے اردو ذریعۂ تعلیم کے امیدواروں کو بطور ترغیب کچھ خصوصی رعایتیں دی جائیں۔ اس کی بدولت اردو کی ترقی و ترویج کے لیے نئی راہیں ہموار ہونگی۔

☆ بذریعۂ اردو اعلیٰ تعلیم کے کورسوں میں داخلے کے لیے بنیادی اہلیت کے امتحان میں نشانات یا نمبرات کی کوئی حد مقرر نہ کی جائے۔ اس کی بدولت نہ صرف تعلیم سے محروم اقلیتوں کو اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے مواقع دستیاب ہوتے ہیں بلکہ اردو ذریعۂ تعلیم کی ترقی اور فروغ کے لیے بھی اسباب پیدا ہوتے ہیں۔

☆ اردو ذریعۂ تعلیم کی ترقی کے لیے اردو کو روزگار سے جوڑنا اشد ضروری ہے۔ لہٰذا اردو ذریعۂ تعلیم کے دائرے میں روزگار سے مربوط فنی و پیشہ ورانہ کورسوں کا انتظام بھی کیا جائے۔ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کی بدولت اردو ذریعۂ تعلیم سے فاصلاتی اور روایتی طرز تعلیم کے تحت اردو کی ترقی اور ترویج میں کافی مدد مل رہی ہے۔ یہ یونیورسٹی چند فنی و پیشہ ورانہ کورسوں کو بھی اردو ذریعۂ تعلیم سے فراہم کر رہی ہے۔ اس یونیورسٹی سے فنی تعلیم کے متعدد کورسوں کی اردو ذریعۂ تعلیم سے فراہمی ہونی چاہیے تاکہ اس یونیورسٹی سے تحریک پاکر دیگر تعلیمی ادارہ جات بھی اردو ذریعۂ تعلیم سے فنی تعلیم فراہم کرنے کے لیے آمادہ ہو جائیں۔ اردو ذریعۂ تعلیم میں روزگار سے مربوط مختلف کورسوں کی عدم موجودگی کی بدولت اردو داں طبقہ انگریزی ذریعۂ تعلیم کی جانب مائل ہو رہا ہے۔ لہٰذا اردو کو روزگار سے جوڑنے کی صورت میں طلبہ و طالبات میں اردو ذریعۂ تعلیم سے متعلق رغبت پیدا ہوگی اور اردو ذریعۂ تعلیم کی ترقی و ترویج کے لیے جدید اسباب پیدا ہوں گے۔

☆ اردو ذریعۂ تعلیم کی ترقی و ترویج کے لیے اردو میں تمام مضامین کی اصطلاحات کا پایا جانا نہایت ہی ضروری ہے۔ لہٰذا جلد از جلد اردو میں تمام مضامین کی اصطلاحات تیار کی جائیں۔

☆ اردو ذریعۂ تعلیم کے فروغ اور اردو ذریعۂ تعلیم کے معیار کو بلند کرنے کے لیے اردو میں تمام مضامین کی معیاری کتابوں کا پایا جانا نہایت ہی ضروری ہے۔ ہندوستان میں قومی سطح پر قومی کونسل برائے فروغ اردو

زبان اور مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی اس کار عظیم کو ممکنہ حد تک انجام دے رہی ہیں۔ ریاستی سطح پر اس غرض کی تکمیل کے لیے اردو اکیڈمی کے مقام پر مقتدر ادارہ برائے فروغ اردو (Urdu Development Authority) کے قیام کو عمل میں لاتے ہوئے فرائض کی انجام دہی کے لیے اس ادارے کو خود مختار موقف عطا کرنا اور اس کے دائرۂ کار میں ادبی ،لسانی، تخلیقی اور تحقیقی کتب کی اشاعت و ترجمہ کی ذمے داری کو شامل کرنا مناسب رہے گا۔

☆ اردو ذریعۂ تعلیم کی ترقی و ترویج کے لیے اردو کو تحقیق سے جوڑنا اشد ضروری ہے۔ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی میں اس خدمت کو بحسن و خوبی انجام دیا جا رہا ہے۔ اس درس گاہ کے علاوہ دیگر یونیورسٹیوں اور ڈگری کالجوں کی سطح پر بذریعۂ اردو اعلیٰ تعلیم سے جڑے ہوئے تمام اہل قلم صاحبین کو اپنے اپنے مضامین میں تحقیقی پروگراموں کی نگرانی کرنے کے مواقع فراہم کیے جائیں۔

توقع کی جاسکتی ہے کہ اردو کے مسائل کی یکسوئی سے متعلق مذکورہ سفارشات پر حکومت کی جانب سے عمل آوری '' اردو بحیثیت ذریعۂ تعلیم'' کے عصری تقاضوں کی تکمیل کرتے ہوئے اردو کو ذریعۂ تعلیم کی حیثیت سے برقرار رکھنے ،اس کو مزید ترقی دینے اردو ذریعۂ تعلیم میں معیار کو یقینی بنانے اور اردو کو روزگار و تحقیق سے جوڑنے میں ممد و معاون ثابت ہوگی۔

اب ہم اردو کے ایسے عصری تقاضوں اور ان سے جڑے ہوئے مسائل و حل کی جانب متوجہ ہوں گے جن کا تعلق اردو بحیثیت دوسری سرکاری زبان سے ہے۔ یہ ایک حقیقت اور فطری عمل ہے کہ عوامی امور عوامی زبان میں ہی انجام دیے جائیں تاکہ عوام اور نظم و نسق کے مابین بہتر رابطہ قائم رہے۔ ہندوستان میں مرکزی سطح پر ہندی اور ریاستی سطح پر ریاستی زبان کو اسی اساس پر سرکاری زبان قرار دیا گیا ہے۔ ریاست آندھرا پردیش ، بہار، اتر پردیش ،دہلی وغیرہ میں جہاں پر اردو کا غلبہ پایا جاتا ہے اردو زبان کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ عطا کیا گیا ہے اور کشمیر میں اردو سرکاری زبان کا موقف رکھتی ہے۔ واضح رہے کہ محض احکامات جاری کرنے سے مطلوبہ مقاصد بر آمد نہیں ہوتے۔ اس کے لیے سنجیدہ اقدامات کی ضرورت لاحق ہوتی ہے ۔اردو کو مختلف ریاستوں میں بحیثیت دوسری سرکاری زبان رائج کرنا اور اردو کے اس موقف کو حقیقی معنوں میں برقرار رکھنا'' اردو بحیثیت دوسری سرکاری زبان'' سے جڑے ہوئے اردو کے عصری تقاضے قرار دیے جاسکتے ہیں۔ ان تقاضوں کی تکمیل کے لیے ان سے منسلک مسائل کو حل کرنا ضروری ہے۔ لہٰذا متعلقہ حکومتوں کو چاہیے کہ اردو کے مذکورہ تقاضوں کی تکمیل کے لیے ان سے منسلک مسائل کو حل کریں اور اس غرض کے لیے حسب ذیل نکات قدم اٹھائیں:

☆ سرکاری دفاتر میں اردو میں پیش کی جانے والی درخواستوں پر عمل آوری کے لیے ان کا ترجمہ ریاستی یا انگریزی زبان میں کرنا نہایت ہی ضروری ہے ورنہ اردو سے ناواقف عملہ اور عہدیداران ان درخواستوں پر ضروری اقدام کرنے سے قاصر رہیں گے۔ لہٰذا ہر سرکاری دفتر میں مترجم کا تقرر عمل میں لایا جائے۔

☆ اردو داں طبقہ بالخصوص مسلمانوں کے لیے ان کی پسماندگی کے پیش نظر تحفظات کو یقینی بنائیں۔ اس کی بدولت سرکاری دفاتر میں اردو ذریعۂ تعلیم اور اردو مادری زبان کے افراد کا تقرر عمل میں آتا رہے گا اور ایسے افراد اردو کو دوسری سرکاری زبان کی حیثیت سے رائج کرنے میں مددگار ثابت ہوتے رہیں گے۔

☆ سرکاری دفاتر میں اردو کے چلن کو عام کرنے کے لیے ضروری ہے کہ اردو میں دفتری اصطلاحات کی لغات موجود ہوں۔ ہندوستان کے شہر حیدرآباد میں اردو کی عظیم جامعہ'' مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی'' اردو ذریعۂ تعلیم کو پروان چڑھاتے ہوئے ترقی کی راہ پر گامزن ہے۔ اس جامعہ میں شعبۂ ترجمہ اور شعبۂ علم سیاسیات و نظم و نسق عامہ بھی موجود ہیں۔ یہ جامعہ اردو میں دفتری اصطلاحات کی لغات کو تیار کرنے کا کام بحسن و خوبی انجام دے سکتی ہے۔ لہٰذا حکومتوں کو چاہیے کہ مذکورہ مقصد کی حصولی کے لیے مذکورہ جامعہ سے ربط پیدا کریں۔

☆ سرکاری سواریوں، بسوں اور دفاتر و سرکاری ادارہ جات کے سائن بورڈس وغیرہ پر تفصیلات اردو زبان میں بھی لکھے جائیں۔ اس اقدام سے اردو زبان کو عوامی مقبولیت حاصل ہوگی۔

☆ انتظامی امور میں اردو کی ترقی و ترویج کے لیے اردو زبان میں دفتری فارمس، رجسٹرس، رسائد، سرکاری اشتہارات اور احکامات وغیرہ کی اجرائی کا انتظام کیا جائے۔

☆ سرکاری دفاتر میں اردو کمپیوٹر اور کمپیوٹر آپریٹری سہولت مہیا کی جائے۔

☆ اردو میں دفتری مراسلت کو عام کرنے کی خاطر اردو درخواستوں کا تصفیہ بروقت کرنے کے لیے عہدیداروں کو سختی سے پابند کیا جائے اور مذکورہ درخواستوں کو نظر انداز کرنے یا ان سے متعلق تساہلی برتنے والے ملازمین و عہدیداروں کے خلاف تادیبی کاروائی کی جائے۔

☆ دوسری سرکاری زبان کی حیثیت سے اردو کے نفاذ کا وقتاً فوقتاً جائزہ لینے، حالات کے لحاظ سے متبادل لائحہ عمل کو معین کرنے اور ان سے متعلق عملی اقدامات کرنے کی ذمے داری ہر ریاست میں مجوزہ مقتدر ادارے برائے فروغ اردو (Urdu Development Authority) پر ہی عائد کی جائے اور ہر ضلع میں اس مقتدر ادارے کی ضلعی شاخ کا قیام عمل میں لاتے ہوئے ضلعی سطح پر انتظامی امور میں اردو کے استعمال کو یقینی بنانے کا کام اس شاخ کو تفویض کی جائے۔

واضح رہے کہ اردو زبان کے مسائل کے حل کے لیے اس وقت ہندوستان میں موافق سیاسی حالات موجود ہیں۔ کئی ریاستوں کے وزیر اعلیٰ مسلم مسائل کی یکسوئی میں دلچسپی رکھتے ہیں' مرکزی و زرا میں وزارت اقلیتی بہبود موجود ہے، ہمارے وزیر اعظم اپنے پندرہ نکاتی پروگراموں کے تحت اقلیتوں کی ترقی کی خاطر بہت کچھ کرنے کے لیے آمادہ ہیں اور مرکزی حکومت سونیا گاندھی کی سرپرستی میں مسلمانوں کی سماجی، تعلیمی اور معاشی پستی کے ازالے کی خاطر سچر کمیٹی سفارشات کو نافذ کرنے کے لیے کوشاں ہے۔ لہٰذا ایسے سازگار حالات میں اگر ذی اثر و بارسوخ اردو داں احباب متحرک ہو جائیں تو مذکورہ سفارشات سے متعلق متعلقہ حکومتوں کی منظوری حاصل کر سکتے ہیں۔ ان سفارشات پر عمل آوری اردو کے تقاضوں کی تکمیل کے لیے اُن سے منسلک مسائل کو حل کرنے میں کارآمد ثابت ہوتے ہوئے اردو ذریعۂ تعلیم کو فروغ دینے' اس کے معیار کو بلند کرنے' اردو کو روزگار سے جوڑنے، اردو کو تحقیقی پروگراموں سے جوڑنے اور دوسری سرکاری زبان کی حیثیت سے اردو کی ترقی و ترویج کو یقینی بنانے میں ممد و معاون ثابت ہوگی۔

مزید یہ کہ اردو زبان کے عصری تقاضوں میں ایک اہم سوال اردو رسم الخط کا تحفظ بھی ہے۔ اردو زبان کا اردو رسم الخط سے اٹوٹ رشتہ ہے۔ اردو رسم الخط کی بدولت اردو زبان کو انفرادی موقف حاصل ہے۔ تاہم آج کل متعصب لوگوں کی اردو دشمنی کی بدولت اردو زبان کے لیے اردو رسم لخط کو ترک کرتے ہوئے دیوناگری رسم الخط کو اختیار کرنے کی مہم چل رہی ہے۔ جس دن اردو زبان کا رشتہ اردو رسم الخط سے ٹوٹ جائے گا' اردو زبان کی انفرادیت ختم ہو جائے گی' اردو ادب کی موت واقع ہوگی اور اردو زبان کا کوئی اپنا وجود باقی نہیں رہے گا۔ لہٰذا اردو زبان کی پہچان کو بنائے رکھنے کے لیے اُس کو اُس کے اپنے رسم الخط سے جدا نہ کرنا اور جب کبھی بھی اردو کے لئے دیوناگری رسم الخط کو اختیار کرنے کی بات کی جائے اُس کی مخالفت کرنا اور اس کے مطالبات کا سدِ باب کرنا اشد ضروری ہے۔

□□□

پتہ:
Dean School of Arts & Social Science
Head, Department of Political Science
and Public Administration, MANUU, Hyderabad.

تعلیمی تشکیل نو کے مسائل

مصنف: خواجہ غلام السیدین

یہ کتاب ماہر تعلیم خواجہ غلام السیدین کے ان مقالات کا مجموعہ ہے جو انھوں نے ملک و بیرون ملک کے سیمیناروں میں پڑھے تھے۔ ان مقالوں میں انھوں نے تعلیمی عمل کو تدریسی اور تنظیمی دونوں نوعیتوں سے دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ موجودہ دور میں تعلیمی، مادی، سماجی اور اخلاقی ترقی سے متعلق جتنی نئی نئی تحقیقات سامنے آرہی ہیں اسی قدر ہم میں ناآسودگی اور بے چینی بھی بڑھتی جارہی ہے۔ ایسے میں محاسبہ، تجزیے اور عمل میں کسی حتمی فیصلے تک پہنچنے کے لیے یہ کتاب ہماری ذہنی تربیت کرتی ہے۔

صفحات: 307، قیمت -/96 روپئے

نوٹ: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کی جانب سے طلبہ اور اساتذہ کے لیے بالترتیب 45% اور 40% کی خصوصی رعایت دی جاتی ہے۔ تاجران کتب کو قومی اردو کونسل کے ضوابط کے مطابق رعایت دستیاب ہے۔ ادارہ

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک-8، ونگ-7، آر۔کے۔ پورم، نئی دہلی-110066

رشید احمد رشید تراپ

نظم اور غزل کی تدریس

کسی بھی زبان اور بالخصوص اردو زبان کے معلم کو تدریس کے فن اور اس کے اسالیب سے اچھی طرح آگاہ ہونا ضروری ہے، طریقہ ہائے تدریس کے لیے اساتذہ کے تربیتی کورسوں مثلاً سی۔ٹی۔بی۔ایڈ۔ اور ایم۔ایڈ۔ وغیرہ میں بہت تفصیل سے بحث کی جاتی ہے اور اکثر و بیشتر اساتذہ ان کا بخوبی مطالعہ کر چکے ہوتے ہیں اور اپنی عملی زندگی میں ان کے استعمال سے خاطر خواہ نتائج حاصل کرتے ہیں، یہاں ان طریقہ ہائے تدریس یا تدریسی مہارتوں سے بحث مطلوب نہیں بلکہ نظم اور بالخصوص غزل کی تدریس کے لیے ایسے اسالیب تدریس پر گفتگو کرنا مقصود ہے جو ایک معلم کے لیے کمرۂ جماعت میں عملی طور پر مفید ہو سکتے ہیں اور تدریس کا عمل نسبتاً بہتر نتائج سے ہمکنار ہو سکتا ہے۔(1)

سب سے پہلے اردو کے معلم کے لیے یہ جاننا ضروری ہے کہ نظم کی تشریح، نثر کی وضاحت یا سلیس زبان میں تبدیل کرنے سے یکسر مختلف ہے۔ نثر میں نثر نگار اپنے خیالات کو وضاحت سے بیان کرتا ہے جب کہ نظم اور غزل میں شاعر انتہائی اختصار سے کام لیتا ہے بلکہ اکثر اوقات وہ اشارے کنایے سے بہت طویل گفتگو کو محض چند الفاظ میں جمع کر دیتا ہے۔ خصوصاً غزل کا معاملہ ایسا ہے کہ اس کا ہر شعر اپنے اندر ایک جامع اور مکمل منظر، واقعہ یا جذبہ رکھتا ہے، گویا دو مصرعے ایک پورے مضمون کا درجہ رکھتے ہیں۔ نظم یا غزل کی ہیئت سے طلبہ کو بھرپور طریقے سے روشناس کرانا بھی معلم کی ذمے داری ہے۔ مطلع، مقطع، ردیف، قافیہ وغیرہ سے واقفیت دلانا، شاعر کے تخلص استعمال کرنے کے مواقع اور بعض اوقات شعری ضروریات کے تحت نام اور تخلص دونوں کا استعمال، مقطع کے علاوہ بعض غزلوں کے مطلع میں تخلص کا استعمال، طویل ردیف اور مختصر ردیف کا فرق جیسے امور سے آگاہی طلبہ کو ان کے فہم و ادراک میں مدد دے سکتی ہے، مثلاً احسان دانش اکثر مجلسوں پر دانش بطور تخلص لاتے ہیں لیکن اس شعر میں "احسان دانش" لکھا ہے:(2)

دوستی احسان دانش کچھ نہیں اس کے سوا
زندگی بھر اعتراف حسن ظن کرتے رہو!

غزل میں مخصوص علامات کا استعمال، قدیم اور جدید علامات میں امتیاز اور علامات کے مفاہیم سے آگاہی بھی طلبہ کے ذہنی ارتقا میں مدد دے سکے گی مثلاً لالہ و گل، نالہ و عندلیب، ہجر و وصال، گل و بلبل، گل و خار، جیسی علامات قدیم علامات ہیں اور خورشید، چراغ، آنسو، لہو، سائے، چھاؤں وغیرہ جدید استعاراتی علامات کی مثالیں ہیں، ہر علامت اپنے مخصوص مقام کے اعتبار سے مختلف معانی رکھتی ہے۔

غزل کی تشریح کے دوران معلم کے لیے ضروری ہے کہ اس کے مختصر الفاظ میں شاعر نے جس نکتے کی طرف اشارہ کیا ہے اسے پوری طرح کھول کر بیان کرے، پورا موضوع سامنے لائے، جس تاریخی واقعہ، جذبہ یا منظر کا ذکر شاعر نے اختصار سے کیا ہے اسے پوری صراحت سے بیان کرے۔ یہ بات تشریح کرتے ہوئے معلم کے پیش نظر رہے کہ شاعر قافیہ اور ردیف کی پابندی پر مجبور ہوتا ہے، اس لیے وہ بسا اوقات ایسے الفاظ استعمال کرنے پر بھی مجبور ہوتا ہے جو نفس مضمون کو نثر کی طرح واضح نہیں کر پاتے، مثلاً احسان دانش کا یہ شعر ملاحظہ ہو:

زندگی یکسر متحرک ہے سکوں یکسر ہے موت
کچھ نہ کچھ اے نوجوانان وطن کرتے رہو!

اب یہاں لفظ "سکون" قطعاً آرام، اطمینان یا راحت کے معنی میں نہیں آیا بلکہ ٹھہراؤ، رک جانے اور ساکت و جامد ہونے کے مفہوم میں آیا ہے۔ اس مصرعے میں وہی تصور دہرایا گیا ہے جو علامہ اقبال کی نظم "چاند اور تارے" میں سادہ الفاظ میں بیان ہوا ہے:

چلنے والے نکل گئے ہیں
جو ٹھہرے ذرا کچل گئے ہیں

مختصر الفاظ میں کسی واقعے کی طرف اشارہ کرنے کی یہ مثال علامہ اقبال کے اس شعر میں ملاحظہ کیجیے، خضر کی معیت میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے طویل سفر اور تین واقعات رونما ہونے کو صرف ایک مصرعے میں سمو دیا گیا ہے:

کشتی مسکین و جان پاک و دیوار یتیم
علم موسیٰ بھی ہے تیرے سامنے حیرت نیوش

اسی طرح اس شعر کے دوسرے مصرعے میں حضرت موسیٰ اور حضرت ابراہیم کے معجزات کو محض چند لفظوں میں بتایا گیا ہے:

مٹ نہیں سکتا کبھی مرد مسلماں، کہ ہے
اس کی اذانوں سے فاش سرِ کلیم و خلیل

معلم کو تحت اللفظ پڑھتے ہوئے بھی شعر کو اس انداز سے پڑھنا چاہیے کہ شعر کے وزن، بحر، تقطیع اور روانی میں فرق نہ آئے نیز یہ کہ بار بار دہرا کر اس انداز سے الفاظ کی ادائیگی کا اہتمام کرے کہ شعر کا مفہوم طلبہ کی سمجھ میں آجائے، شعر کی نوعیت کے مطابق اسے یہ علم ہونا چاہیے کہ کس لفظ پر زور دینا ہے، کس جگہ وقفہ کرنا ہے، کس جگہ دھیما لہجہ اختیار کرنا ہے۔ مرزا غالب کا ایک شعر ہے:

آتا ہے میرے قتل کو، پر، جوشِ رشک سے
مرتا ہوں اس کے ہاتھ میں تلوار دیکھ کر

اب اگر ''قتل کو'' اور ''پر'' کے بعد پڑھنے میں مناسب وقفہ نہ کیا جائے تو غلطی کا یقینی امکان ہے اور اگر اسی لفظ کو ''پُر جوش'' پڑھ لیا جائے تو مفہوم بالکل ہی تبدیل ہو جائے گا۔ اسی طرح ایک سادہ سی مثال اس شعر میں ملاحظہ کی جاسکتی ہے:

دیوار کیا گری مرے کچے مکان کی
لوگوں نے میرے صحن سے رستے بنا لیے!

دیوار کا گرنا، مکان کا کچا ہونا، صحن سے رستے بنالینا کیسی سادگی اور شعری حسن ہے۔ اب دیکھیے کہ اگر شعر میں ''رستے بنا لیے'' کو ''رستہ بنالیا'' پڑھ یا لکھ دیا جائے تو فرق محسوس کیا جاسکتا ہے، یعنی بہت سے لوگ ایک ہی راستہ بنا کر گزر رہے ہیں تو اتنی عیب دار بات نہ ہوگی کہ نظم وضبط برقرار ہے۔ منظم انداز سے ایک ہی رستہ سے گزر کر جا رہے ہیں لیکن ''رستے بنا لیے'' سے بات کچھ اور بن جاتی ہے۔ گویا بے ہنگم اور بے ترتیب پگڈنڈیاں اور گزرگاہیں اختیار کی گئی ہیں۔ کئی رستے، اپنی اپنی مرضی سے، گویا شاعر کو بے وقعت سمجھ کر لوگ من مانی کر رہے ہیں اور اس بیچارگی پر شاعر کی بے بسی اپنی جگہ تخیل کا عروج ہے۔ ایسے ہی نکات سے بحث کی جائے تو تدریس مفید رہتی ہے۔

اکثر دیکھا گیا ہے کہ نعت، نظم یا غزل وغیرہ کے اشعار جب کسی ذاکر کی زبانی ترنم سے پڑھے جاتے ہیں تو ناخواندہ افراد بھی ان کا مفہوم بخوبی سمجھ جاتے ہیں۔ اسی طرح قوال لوگ اپنے جسم اور ہاتھوں کی حرکات کی مدد سے اپنے سامعین اور ناظرین پر ادراک اور افہام کے دریچے کھول دیتے ہیں۔ ایک کامیاب معلم کمرۂ جماعت میں اپنے ہاتھوں شانوں، سر، آنکھوں اور دیگر اعضا کی مخصوص حرکات سے طلبہ کو مفہوم سمجھانے میں خاصی معاونت دے سکتا ہے۔

یہ امر بھی ملحوظ رہے کہ سیکنڈری اور انٹرمیڈیٹ سطح کے طلبہ کے ذہن ناپختہ ہوتے ہیں اور اسی طرح ذوق بھی ادھورے ہوتے ہیں۔ ان کے جذبات میں تجربات کا دخل نہیں ہوتا۔ وہ صرف پرواز کے متمنی ہوتے ہیں۔ سفر کے خطرات اور ممکنہ پیش آمدہ مسائل سے بے خبر ہوتے ہیں جبکہ غزل چاہے حقیقی عشق سے متعلق ہو یا مجازی رنگ پر مبنی ہو، اس میں ساغر و مینا، جام و مے اور بادہ و ساقی کا ذکر آنا طبعی اور فطری امر ہے بلکہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ غزل میں ان علامات کا آنا ناگزیر ہے۔ ایسے مقامات پر معلم کو بہت محتاط انداز اختیار کرنا ہوگا کیونکہ ناپختہ ذہنوں کے بھٹک جانے اور تعمیر کی بجائے تخریب کی جانب مائل ہو جانے کا اندیشہ ہے۔

شعر کو نثر میں تبدیل کرنے کے لیے بھی ضروری ہے کہ شعر کی ترتیب کا درست ادراک ہو۔ چونکہ شعر میں الفاظ کی ترتیب یکسر مختلف ہوتی ہے اس لیے غلط ادائیگی کے سبب غلط نثر بنانے کا احتمال رہتا ہے جس سے مفہوم میں خاصا فرق پڑ سکتا ہے۔ مثلاً فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں مرحوم کے ایک انتخابی جلسے میں ایک کارکن مقرر نے علامہ اقبالؒ کے ایک معروف شعر:

ایک ہوں مسلم، حرم کی پاسبانی کے لیے
نیل کے ساحل سے لے کر تابخاکِ کاشغر

کے پہلے دو الفاظ ''ایک ہوں'' (بمعنی متحد ہو جائیں) کو ''ایک ہوں'' (میں اکیلا ہی ہوں) پڑھ دیا ۔۔۔ اب اندازہ لگائیے کہ ''ٹوٹی کہاں کمند''۔ شعر کو نثری عبارت میں تبدیل کرتے وقت اپنی طرف سے کوئی اضافہ نہ کیا جائے تو بہتر ہے۔ البتہ حروف جار، حرف عطف، یا اضافت کی حد تک، جہاں بہت ناگزیر ہو تو اس کا الگ سے اظہار طلبہ کے ادراک کے لیے مفید ہوگا لیکن حتی الامکان ان سے بھی گریز کیا جائے اور یہ کہ جب یہ عمل تحریری صورت میں ہو تو اضافہ والے حروف کو واوین ('' '') کے اندر لکھا جائے مثلاً خواجہ حیدر علی آتش کا شعر ہے:

سن تو سہی جہاں میں ہے تیرا فسانہ کیا
کہتی ہے تجھ کو خلقِ خدا غائبانہ کیا!

نثر: ''سن تو سہی جہاں میں تیرا فسانہ کیا ہے'' اور ''تجھ کو خلقِ خدا غائبانہ کیا کہتی ہے؟''

ایک ضروری توضیح یہ بھی ہے کہ جب معلم کسی غزل یا نظم کے کسی حصے کی تشریح کر رہا ہو تو تفہیم مطالب کے لیے پس منظر کے طور پر ان مناظر، جذبات یا حالات و واقعات کا ذکر بھی کرے، جن سے شاعر کی یہ تخلیق یا اس تخلیق کی تحریک پیدا ہوئی ہو۔ اگر مسلسل واقعہ یا کہانی، داستان وغیرہ کی صورت سامنے ہو تو جس طرح نثر میں سیاق و سباق ضروری ہوتا ہے اسی طرح نظم میں بھی گذشتہ حالات و واقعات کا تسلسل ضروری ہوتا ہے (غزل میں ایسی صورت کم ہی پائی جاتی ہے البتہ مثنوی یا طویل نظم میں پائی جاسکتی ہے جیسے ''مدوجزرِ اسلام'' (مسدس حالی)، شکوہ، جواب شکوہ از علامہ اقبالؒ اور مراثی وغیرہ) ان کے کسی بھی مختصر حصے کی تشریح مکمل نہ سمجھی جائے گی جب تک اس کے پچھلے حصے یا حصوں میں بیان کیے گئے واقعات یا مناظر سے اسے مربوط نہ کیا جائے گا۔ مثلاً ''مدوجزرِ اسلام'' کا کوئی بھی حصہ یا چند بند (جو شامل نصاب ہوں) پڑھانے سے پہلے یہ واضح کرنا ضروری اور مفید ہوگا کہ نبی کریم ﷺ کی بعثت سے پہلے عربوں کی کیا حالت تھی اور اعلان نبوت کے بعد معاشرتی، تہذیبی، علمی، سیاسی، معاشی، سماجی، ثقافتی، فنی اور دیگر میدانوں میں کس طرح یکسر تبدیلی آئی اور یہ بھی وضاحت ضروری ہوگی کہ حالی کی اس نظم کا مقصد مسلمانوں کو ان کا ماضی یاد کرا کے ان میں اسلامی اقدار کا احیا کرنا اور انھیں اسلامی شعائر کی پابندی

کرنے کی ترغیب دینا تھا۔ اسی طرح جب کسی مرثیے کا کوئی بند یا چند بند پڑھانے ہوں تو بھی واقعۂ کربلا کا پس منظر اور تاریخی و مذہبی اہمیت اجاگر کرنا ضروری ہے۔ یزیدیت اور حسینیت جیسی ترکیبوں سے متعارف کرانا بھی مفید ہوگا اور اس جذبے کو اجاگر کرنا بھی ناگزیر ہے کہ امام حسین علیہ السلام نے یزید کی بیعت نہ کرنے میں آنے والی نسلوں کے لیے یہ پیغام جاوداں کر دیا کہ خلافتِ الٰہی محض اللہ تعالیٰ کی امانت ہے۔ بادشاہت کے نشے میں من مانی کرنے والے خلافت کے حقدار نہیں ہوتے، ان سے جہاد کرنا بھی مومن کے لیے لازم ہے اور جان کی بازی لگانا بھی اس کے شایانِ شان ہے۔

حسبِ ضرورت اور موقع و محل کی مناسبت سے ایک شعر کی شرح میں اسی موضوع یا قبیل کے دیگر اشعار (چاہے وہ اسی شاعر کے ہوں یا دیگر شعرا کے) سے مطابقت قائم کی جاسکتی ہے، مثلاً مرزا غالب کہتے ہیں:

لازم نہیں کہ سب کو ملے ایک سا جواب
آؤ نہ ہم بھی سیر کریں کوہِ طور کی

علامہ اقبالؔ کا شعر ہے:

صدائے 'لن ترانی' سن کے اے اقبال میں چپ ہوں
تقاضے کی کہاں طاقت ہے مجھ فرقت کے مارے میں (7)

اب موسیٰ علیہ السلام کا کوہِ طور پر جانا اور جلوۂ یزداں کے مشاہدے کی فرمائش کرنا اور باری تعالیٰ کی جانب سے اس فرمائش سے باز رہنے کا مشورہ دینا اور پھر ہلکی سی تجلی سے پہاڑ کا جل کر خاکستر ہو جانا، یہ سب وضاحت طلب امور ہیں اور اس طرز کے کئی اشعار یکے بعد دیگرے پیش کر کے تدریس کا حق ادا کیا جاسکتا ہے، مثلاً غالب ہی کا ایک دیگر انداز:

گرنی تھی ہم پہ برقِ تجلی، نہ طور پر
دیتے ہیں بادہ ظرفِ قدح خوار دیکھ کر

ایک اور مثال ملاحظہ ہو مرزا غالب کا شعر ہے:

رَو میں ہے رخشِ عمر کہاں دیکھیے تھمے
نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں

اسی سے ملتا جلتا مفہوم علامہ اقبالؔ کے اس شعر میں بھی ہے:

ہے دوڑتا شہب زمانہ
کھا کھا کے طلب کا تازیانہ!

خواجہ آتش نے بھی اسی سے ملتی جلتی حقیقت بیان کی ہے:

اُڑتا ہے شوقِ راحتِ منزل سے اسپِ عمر
مہمیز کس کو کہتے ہیں اور تازیانہ کیا!

ان تینوں شعروں میں زندگی کی بے ثباتی لیکن زندہ رہنے کی طلب، تحریک اور آرزو کا ذکر کیا گیا ہے اور رخشِ عمر، اشہبِ زمانہ، اسپِ عمر، تازیانہ اور رکاب جیسی تشبیہات و استعارات سے لفظی مناسبت کا کمال دکھایا گیا ہے۔ معلم کا مطالعہ وسیع اور مسلسل ہو تو ایک شعر کو دوسرے کی وضاحت میں اور دوسرے کو تیسرے کی تمثیل کے طور پر یکے بعد دیگرے پیش کر کے مطالب بھی واضح کر سکتا ہے اور شعرا کے کمالِ سخن کی مطابقت اور تفریق کی ترجمانی بھی کر سکتا ہے، اس سے طلبہ میں بھی وسعتِ مطالعہ کا شوق پیدا ہوگا۔

یہ امر بھی ملحوظ رہے کہ تشریح کرتے ہوئے کبھی طولِ تقریر کا خوف طاری نہ ہونا چاہیے۔ طلبہ کو پہلے سے اس بات پر آمادہ ہونا چاہیے کہ نظم اور بالخصوص غزل کی تشریح کے لیے نثری اسباق کی طرح محدود اور مختصر وقت سے کام نہیں چلایا جاسکتا، اگرچہ کبھی شعر اس طرح کے نہیں ہوتے کہ ان کی تشریح کے لیے فی شعر پورا ایک لیکچر مطلوب ہو لیکن بہت سے اشعار ایسے بھی ہوتے ہیں جن میں محض چند لفظوں میں پورا واقعہ بیان کیا گیا ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ان کی تشریح کے لیے وقت درکار ہوگا۔

مثلاً علامہ اقبالؔ کا یہ شعر:

جمہوریت اک طرزِ حکومت ہے کہ جس میں
بندوں کو گنا کرتے ہیں، تولا نہیں کرتے

اگرچہ زبان کے اعتبار سے بہت سادہ اور سلیس الفاظ پر مشتمل ہے لیکن ایک پورے نظام پر منطقی تنقید ہے اور اسلام کے مشاورتی طرزِ انتخابِ خلیفہ کی طرف اشارہ ہے جو اگرچہ مخفی انداز میں ہے لیکن اس کو واضح کرنا ضروری ہے۔ بندوں کی گنتی میں جاہل، اجڈ، علم و عمل سے دور بھی لوگ ایک ہی مقام پر ہیں، ان کا ووٹ بھی اتنا ہی قیمتی ہے جتنا ایک عظیم سیاستداں یا باشرع صوفی بزرگ کا! یہ واضح کر دینا بھی ضروری ہے کہ علامہ مرحوم جمہوریت اور آمریت دونوں کو ناپسند فرماتے تھے۔ صرف اسلامی طرزِ حکومت یعنی خلافت کے حق میں تھے اور خلیفہ کا انتخاب کثرتِ رائے سے نہیں، صائب الرائے لوگوں کی مشاورت سے اور پھر بیعت کے طریقے سے ہونا پسند کرتے تھے۔ اسی طرح علامہؒ ہی کا ایک اور شعر ہے:

ہے دل کے لیے موت مشینوں کی حکومت
احساسِ مروّت کو کچل دیتے ہیں آلات

سادہ الفاظ کے باوجود یہ شعر اپنے اندر ایک پورے نظام پر اعتراضات کا وسیع سلسلہ رکھتا ہے اور گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ اس حقیقت کی صداقتوں میں مزید اضافہ ہوتا چلا جارہا ہے۔ اب یہ آلات جنگی جاہی سے متعلق ہوں، فاشی اور فیشن پرستی پھیلانے والے ذرائع ہوں یا آلودگی میں اضافہ کرنے والی مشینوں اور کارخانوں کا حوالہ دیں، ہر لحاظ سے مروّت کو کچلا جارہا ہے۔ نظم

خصوصاً غزل کے بعض اشعار ایسے بھی ہوتے ہیں کہ شاعر اپنے تخیل کے زور سے پورا واقعہ یا منظر (اگرچہ بظاہر موجود نہیں ہوتا) تخلیق کرتا ہے، ایسے میں زبان کے معلم کے لیے لازم ہے کہ ہاتھوں اور دیگر اعضا کی مخصوص حرکات کی مدد سے اور الفاظ کے مناسب استعمال سے اس منظر کو واضح کرے جس کی خاطر شاعر نے اپنی تخیلانہ پرواز کی معراج حاصل کی ہے۔ ایک سادہ سی اور دلچسپ مثال ملاحظہ ہو، شعر ہے:

ساقی در میخانہ ابھی بند نہ کرنا
شاید مجھے جنت کی ہوا راس نہ آئے

یہاں صرف یہ بتا دینا کافی نہ ہوگا کہ شاعر نے اپنے گناہوں کے پیش نظر اپنے احساس کی بدولت یہ تصور قائم کیا ہے کہ چونکہ وہ گناہوں کی زندگی میں اس قدر رچ بس گیا ہے کہ شاید جنت کا حسین اور پاکیزہ، خوشگوار اور پرسکون ماحول اسے راس نہ آئے۔ اسی لیے شاعر کہتا ہے کہ ساقی! میخانے کے دروازے کھلے رکھنا تاکہ جنت کا ماحول راس نہ آنے پر میں یہاں واپس آسکوں۔

شاعر کے کلام خصوصاً غزل کے معاملے میں ناقدانہ رائے اور تبصرہ بھی ضروری ہے خواہ وہ صرف ایک جملے پر مشتمل ہو۔ تنقید دراصل ادبی یا شعری محاسن کو کہتے ہیں۔ معلم کو چاہیے کہ تشریح کے دوران یا تشریح کے آخر میں ایک دو جملے ایسے ضرور کہے جن سے تبصرے کی حد تک حق ادا ہو جائے۔ ایسے جملوں کی چند مثالیں درج ذیل ہیں۔ مثلاً علامہ اقبالؒ اپنی ایک نظم ''ایک آرزو'' میں کہتے ہیں:

ہو ہاتھ کا سرہانا، سبزے کا ہو بچھونا
شرمائے جس سے جلوت، خلوت میں وہ ادا ہو

تو کہا جاسکتا ہے ''یہاں کتنی سادگی اور بے تکلفی کی طلب کا مظاہرہ ہے'' یا ''سادگی، سلاست اور روانی کی عمدہ مثال ہے''۔ اسی طرح ابوالاثر حفیظ جالندھری کی نعت کا ایک شعر ہے:

محمدؐ ہے متاعِ عالمِ ایجاد کا پیارا
پدر، مادر، برادر، جان، مال، اولاد سے پیارا

تو اس شعر کی تشریح میں اس حدیث کا حوالہ دینا مناسب اور مفید ہوگا:

لایؤمن احد کم حتّی اکون احب الیه من والده وولده والناس اجمعین. اسی طرح یہ شعر:

سلام اس پر کہ جس نے گالیاں سن کر دعائیں دیں
سلام اس پر کہ جس نے خوں کے پیاسوں کو قبائیں دیں

اس ضمن میں طائف کا واقعہ کہ ناراض اور بپھرے ہوئے لوگوں کے لیے جو آپؐ پر پتھر پھینک رہے تھے، آپؐ نے دعا فرمائی ''یا اللہ! انھیں ہدایت دے'' اور فتح مکہ کے موقع پر ابوسفیان جیسے دشمنوں کو یہ اعزاز بخشا کہ جو اس کے گھر میں پناہ لے اس کے لیے بھی عافیت ہے نیز یہ کہ لاتثریب علیکم الیوم کا اعلان فرما کر رحمۃ للعالمینی کا اعلیٰ و ارفع مظاہرہ فرمایا، مولانا الطاف حسین حالی کا (مدوجزر اسلام کا) یہ شعر ہے:

ہر اک شہر و قریہ کو یونان بنایا
مزہ علم و حکمت کا سب کو چکھایا

یونان جو قدیم تہذیب اور علم و حکمت کا مرکز مانا جاتا ہے اور صدیوں سے اس کی اہمیت مسلم ہے، مسلمانوں نے نبی اکرمؐ کی تربیت کے زیر اثر تھوڑے ہی عرصے میں اپنے زیر نگیں علاقوں میں اور ان کے ہر شہر اور بستی میں قدیم یونان جیسی تہذیب کی داغ بیل ڈالی اور علاقے کو علم و حکمت کا گہوارہ بنا دیا۔

تعلیم نسواں کے ضمن میں ایک زمانے میں یہ شعر زبان زد عام تھا:

حامدہ چمکی نہ تھی انگلش سے جب بیگانہ تھی
رونقِ محفل ہے اب پہلے چراغِ خانہ تھی

ایسا کوئی معاملہ زیر بحث ہو تو نظریے سے اتفاق یا اختلاف دونوں صورتوں سے طلبہ کو مناسب دلائل سے مالا مال کرنا معلم کی ذمے داری ہے۔

اسی طرح تبصرے کے لیے چند جملے ضرور ذہن میں رکھے جائیں اور بوقت ضرورت ان سے استفادہ کیا جائے مثلاً:

شاعر نے دریا کو کوزے میں بند کر دیا ہے۔ یہ شعر پرواز تخیل کی عمدہ مثال ہے۔ شاعر نے منفرد تخیل اور اسلوب سے کام لیا ہے۔ الفاظ و تراکیب میں ایسی جدت ہے جیسے ہیرے جڑے ہوں۔ الفاظ کی تکرار نے ترنگ اور ترنم میں اضافہ کر دیا ہے۔ ایسی فصاحت و بلاغت میر ہی کو زیب دیتی ہے۔ میر کا یہ شعر سوز میں ڈوبا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ درد کا ہر شعر تقریباً ایسے ہی درد میں کہا گیا ہے۔ قوم کی زبوں حالی کو حالی سے بڑھ کر کون بیان کرسکتا ہے۔ اقبالؒ کا سارا کلام اسلامی شعائر کی عکاسی ہے۔ ظفر علی خاں کی نعتیں عشق رسولؐ سے لبریز ہیں، وغیرہ وغیرہ۔

آخر میں معلمین حضرات سے ایک ضروری گزارش ہے کہ غزل کی تدریس کے دوران ان امور کو ضرور ملحوظ رکھیں:

1. شعر کے صرف ظاہری مفہوم پر اکتفا نہ کیا جائے بلکہ اس کے پس منظر میں موجود جذبے یا احساس کو ضرور نمایاں کیا جائے۔ مثلاً علامہ اقبالؒ کہتے ہیں:

نگاہِ فقر میں شانِ سکندری کیا ہے
خراج کی جو گدا ہو وہ قیصری کیا ہے

تو جب تک ''سکندری'' (سکندر اعظم اور قیصری (قیصر روم) کے پس منظر

اور حالات کا تذکرہ نہ ہوگا تو شعر واضح نہ ہوگا اور نہ ہی تشریح کا حق ادا ہوگا۔

2. ہر شعر اپنے اندر احساسات کی ایک وسیع دنیا رکھتا ہے حتی المقدور اس وسعت کا احاطہ کرنا معلم کا فریضہ ہے۔ کمرۂ جماعت میں شاعرانہ فضا پیدا کر کے تخیل اور احساسات لطیفہ کو اجاگر کرنا چاہیے۔ مثلاً حسرت موہانی کہتے ہیں:

دیکھو تو چشمِ یار کی جادو نگاہیاں
بے ہوش اک نظر میں ہوئی انجمن تمام

اب اگر آپ اسے حقیقی رنگ میں ڈھالنے کے متمنی ہیں تو اس وسیع المشرب شاعر کی پرواز تخیل پہ صدقے جایئے گا۔ سامنے کے مفہوم کے علاوہ ایک مفہوم یہ بھی نکلتا ہے کہ انجمن کائنات کی ہر ایک شے جمالِ مصطفےٰ کے سحر سے سرشار ہے اور نورِ مصطفیٰ کی ضیا پاشیوں سے پورا جہاں منور ہے۔ پھر یہ بھی کہ جس پر ان کی نظرِ التفات پڑی اسے اپنے رنگ میں رنگ دیا اور نورِ ایمان سے فیضیاب کر دیا۔

3. غزل کے اکثر اشعار ایسے ہوتے ہیں جو اپنے طور پر مجازی اور حقیقی دونوں مفاہیم کے متحمل ہو سکتے ہیں۔ ضروری ہے کہ دونوں کو کھول کر بیان کیا جائے، مثلاً میر تقی میر کا ایک شعر ہے:

جو تجھ بن نہ جینے کو کہتے تھے ہم
سو اس عہد کو اب وفا کر چلے!

یہاں مجازی محبوب کے بغیر نہ جینے کا تصور بھی قائم کیا جا سکتا ہے۔ حقیقی عشق کی بات کریں تو مثال میں حضرت بلالؓ کا تذکرہ کر سکتے ہیں کہ حضورؐ کے وصال کے بعد اذان کہنا چھوڑ دی اور جب بہ اصرار نواسۂ رسول کی جانب سے فرمائش کی گئی تو ''اشہد ان محمد رسول اللہ'' کے الفاظ کے ساتھ ہی ان کی روح پرواز کر گئی، گویا اللہ کے رسول کو سامنے دیکھنے کے دوران تو اذان نہیں کہنا، ان کے لیے دیدار کا بہانہ تھا۔

4. دیگر مضامین سے ربط پیدا کرنا بھی ضروری ہے۔ جہاں منطقی حقائق کی بات ہے تو ریاضی کی سادہ مثالیں دی جا سکتی ہیں۔ تاریخی واقعہ ہو تو تاریخ سے حوالہ دیا جا سکتا ہے۔ اسی طرح سائنس، طب، اسلامی علوم وغیرہ مضامین سے ربط پیدا کیا جا سکتا ہے صرف ایک مثال ملاحظہ ہو:

فضائے بدر پیدا کر، فرشتے تیری نصرت کو
اتر سکتے ہیں گردوں سے قطار اندر قطار اب بھی

اس شعر کی تشریح کے دوران غزوۂ بدر میں مسلمان مجاہدین کی قلیل تعداد (313) کے باعث فرشتوں کا اترنا اور نصرت غیبی کے سبب مسلمانوں کا فتحیاب ہونا۔ پھر غزوۂ احد میں وقتی ناکامی اور سورۂ آل عمران کی ان آیات کا حوالہ جن میں باری تعالیٰ نے احساس دلایا کہ بدر میں ہم نے فرشتوں کے ذریعے تمھاری مدد فرمائی تھی۔ ایسی مثالیں دے کر یہ باور کرانا ضروری ہے کہ نصرت خداوندی ہمہ وقت آمادہ بہ کرم ہے بشرطیکہ ایمان کامل ہو۔ بیانِ مطالب میں وسعت نظری پیدا کرنے کے لیے ایسے شعر شامل کیے جائیں:

آج بھی ہو جو ابراہیم کا ایماں پیدا
آگ کر سکتی ہے اندازِ گلستاں پیدا

5. کسی شعر کا مفہوم واضح کرنے کے لیے اسی موضوع، جذبے، احساس یا صداقت پر مبنی اسی شاعر کے یا دیگر شعرا کے زیادہ سے زیادہ شعر حافظے میں رہنے چاہئیں تاکہ بوقت ضرورت کام آسکیں البتہ اختلافی موضوعات جن سے سب کو اتفاق نہ ہو، ان کی تردید اور تائید دونوں نوعیتوں کے شعر حافظے میں رہیں۔ اس کے لیے معلم کو مسلسل مطالعہ کرتے رہنا چاہیے بلکہ تحقیقی کام جاری رکھنا چاہیے۔ مثال کے طور پر ان شعروں میں ایک ہی صداقت سامنے آرہی ہے:

قطرہ آغوشِ تلاطم میں گہر بنتا ہے
آبرو چاہے تو طوفان میں گھر پیدا کر
تمنا آبرو کی ہے اگر گلزار ہستی میں
تو کانٹوں میں الجھ کر زندگی کرنے کی خوکر لے
رنگ ہو یا خشت و سنگ چنگ ہو یا حرف و صوت
معجزۂ فن کی ہے خونِ جگر سے نمود

ان سبھی شعروں میں ''سخت کوشی'' کا درس دیا گیا ہے۔ ایسی بے شمار مثالیں دی جا سکتی ہیں۔

6. محاورات اور روزمرہ کی وضاحت بھی ضروری ہے اور جہاں منفرد قسم کے یا غیر مروج محاورے کا معاملہ ہو تو یہ وضاحت بھی ضروری ہوگی کہ اس شاعر نے اپنے طور پر اسے برتا ہے یا تخلیق کیا ہے۔ عام طور پر مستعمل نہیں۔

7. مخصوص علامات اور تراکیب کی وضاحت بھی ضروری ہے مثلاً اقبال کا شاہین، مردِ مومن، فقر، چراغ، مصطفوی وغیرہ مخصوص علامتیں ہیں نیز دل بینا، نیش عقرب، آرائش جمال، شادیٔ مرگ، کوچۂ جاناں، کوئے یار، فرنگ، اہلِ وطن، نگاہ آئینہ ساز، مینا و جام جیسی تراکیب خاص وضاحت کی متقاضی ہیں۔ علامتوں میں ابہام نہ رہنے دیا جائے مثلاً ''رنگ و خون'' سے مراد نسلی تعصب ہے جبکہ ''رنگ و بو'' سے رعنائی و رنگینی مراد ہے۔ مثلاً علامہ اقبال کے یہ دو شعر:

بتانِ رنگ و خوں کو توڑ کر ملت میں گم ہو جا
نہ تو رانی رہے باقی، نہ ایرانی، نہ افغانی

اور

آہ! کھولا کس ادا سے تو نے رازِ رنگ و بو
میں ابھی تک ہوں اسیر امتیازِ رنگ و بو

□□□

(بہ شکریہ ''اخبار اردو'' اسلام آباد، مئی 2008)

پردیپ جین

پریم چند کا ایک بھولا بسرا افسانہ — سودائے خام

کلکتہ سے 1911 میں ''کامریڈ'' نامی انگریزی اخبار کا اجرا کرنے کے بعد مولانا محمد علی نے 23 فروری 1913 کو دلی سے اردو روزنامہ ''ہمدرد'' کا اجرا کیا۔ ''ہمدرد'' کی اشاعت کا سلسلہ 10 اگست 1915 تک چلتا رہا۔ اس کا دوسرا دور 9 نومبر 1924 سے شروع ہوکر 12 اپریل 1929 کو ختم ہوا جس کے بعد یہ اخبار ہمیشہ کے لیے بند ہوگیا۔ ''ہمدرد'' کے دورِ اوّل میں پریم چند کے کچھ افسانے بھی اس میں شائع ہوئے تھے جس کی نسبت محترم مانک ٹالا رقم طراز ہیں:

''پہلے دور میں ''ہمدرد'' میں پریم چند کی بھی چند کہانیاں شائع ہوئی تھیں جن میں سے درج ذیل چار کہانیوں کا پتہ چلتا ہے۔ (1) آبِ حیات؛ یکم جون اور 3 جون 1913 کی دو اشاعتوں میں، (2) بانگ سحر؛ 11 جون اور 13 جون 1913 کی دو اشاعتوں میں، (3) داروئے تلخ؛ 13، 18 اور 19 جولائی کی تین اشاعتوں میں، (4) نمک کا داروغہ؛ 10 اکتوبر 1913 کی اشاعت میں۔'' (پریم چند حیات نو صفحہ 168)

مذکورہ بالا چار کہانیوں کے علاوہ مانک ٹالا صاحب ''ہمدرد'' میں شائع ہونے والے پریم چند کے کسی اور افسانے کا ذکر اپنی کسی بھی کتاب میں نہیں کرتے۔ مگر اسی اخبار میں شائع شدہ پریم چند کے ایک افسانے کو نایاب تحریر کرتے ہوئے ڈاکٹر کمل کشور گوئنکا یوں رقم طراز ہیں:

''1914۔ اگست۔ سودائے خام۔ ہمدرد ماسک۔ کہانی۔ اپراپیہ''

(پریم چند کا اپراپیہ ساہتیہ، جلد 2، صفحہ 684)

مندرجۂ بالا اقتباس میں ڈاکٹر گوئنکا ''ہمدرد'' کو ایک ماہنامہ رسالہ بتارہے ہیں جبکہ درحقیقت یہ روزنامہ تھا۔ نیز انھوں نے یہ اطلاع دینے کی ضرورت بھی محسوس نہ کی کہ یہ افسانہ مذکورہ اخبار کے کس تاریخ کے شمارے میں شائع ہوا تھا۔ اپنی مذکورہ نامکمل اور غلط اطلاع کو ڈاکٹر گوئنکا نے 2005 میں پہلی مرتبہ اپنی کتاب میں پریم چند کی بقیہ نایاب کہانیوں کی فہرست میں درج ذیل الفاظ میں پیش کیا ہے:

''سودائے خام؛ اردو کہانی، ہمدرد، اگست 1914''

(پریم چند کی اپراپیہ کہانیاں، صفحہ 278)

محترم گوپال کرشن مانک ٹالا نے اپنی خرابی صحت کی وجہ سے اپنے تحقیقی کام کی روایت کو جاری رکھنے کی ذمے داری راقم الحروف کو سونپنے کا فیصلہ کیا اور راقم کو ممبئی طلب کرکے پریم چند ادبیات پر اپنا تمام ادبی سرمایہ سپرد کردیا۔ موصولہ ذخیرے میں راقم کو کسی رسالے سے علاحدہ کیے ہوئے چند اوراق دستیاب ہوئے جن کے صفحۂ اوّل پر ''گوشۂ پریم چند'' چھپا ہوا ہے۔ ان اوراق میں مانک ٹالا صاحب کی کتاب ''پریم چند: کچھ نئے مباحث'' کے مستعملات کی فہرست، پریم چند کے دو مضامین ''قرآن میں فرقہ وارانہ اتحاد کے عناصر'' اور ''ملکانہ راجپوت مسلمانوں کی شدھی'' شامل ہیں۔ ان کے علاوہ ڈاکٹر رضوان احمد خاں کا مضمون ''پریم چند اور خونِ حرمت'' بھی شامل ہے۔ انھی اوراق میں صفحہ 259 تا 264 پریم چند کی کہانی ''سودائے خام'' بھی درج ہے جس کے اخیر میں ایک بریکٹ میں ''از ہمدرد'' چھپا ہوا ہے۔

مذکورہ اوراق پر رسالے کا نام اور زمانۂ اشاعت کہیں درج نہیں ہے۔ لہٰذا یقینی طور پر یہ نہیں کہا جاسکتا کہ پریم چند کا یہ نایاب افسانہ کس رسالے کے کس شمارے میں شائع ہوکر دوبارہ منظرِ عام پر آچکا ہے۔ مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مذکورہ اوراق کراچی (پاکستان) سے شائع ہونے والے رسالے ''نگار'' کے جولائی 1989 کے شمارے سے علاحدہ کیے گئے ہیں۔ مگر یہ صرف اندازہ ہے، یقینی طور پر مانک ٹالا صاحب ہی اس کی نسبت کچھ کہہ سکتے ہیں۔

پریم چند کا یہ بھولا بسرا افسانہ اندازاً 20 برس قبل دستیاب ہوجانے کے باوجود ''کلیاتِ پریم چند''، ''پریم چندر چناولی'' اور ''پریم چند کی اپراپیہ کہانیاں'' میں شامل نہ ہوسکا۔ یہ اس بات کا پختہ ثبوت ہے کہ ماہرینِ پریم چند ادبیات تحقیق میں کتنی سہل پسندانہ روش اختیار کرتے ہیں۔

پریم چند کا بھولا بسرا افسانہ سودائے خام ہدیۂ ناظرین ہے؛ اور امید ہے کہ جن حضرات کے پاس کلیاتِ پریم چند، پریم چند رچناولی یا پریم چند کی اپراپیہ کہانیاں موجود ہیں وہ ان اوراق کو ان میں محفوظ کرلینے کی زحمت گوارا کریں گے۔

افسانہ — سودائے خام:

(1) شام کا وقت تھا۔ لہٰ آباد سنٹرل جیل کے سامنے چھتنار برگد کے درخت کے نیچے دو سپاہی بیٹھے ہوئے تھے۔ سبزہ آغاز کارے سنگھ زور زور سے بھنگ پیس رہا تھا، اور یہ کوشش کررہا تھا کہ سل بٹنے کے ساتھ اُٹھ آئے، اور سیہ فام رستم خاں آہستہ آہستہ افیون گھولتے تھے۔ دونوں کے چہرے شگفتہ تھے۔ دونوں مسکرا مسکرا کر ایک دوسرے کی طرف تاکتے تھے۔

کارے سنگھ نے کہا: ''آج اچھے آدمی کا منہ دیکھا تھا۔''

رستم خاں نے افیون کا ایک گھونٹ پیا اور منہ بناتے ہوئے بولے: ''معلوم ہوجائے تو میں اس بھاگوان کو ڈبے میں بند کرلوں اور روز درشن کیا کروں۔''

کارے سنگھ نے بھنگ کا ایک بیضاوی گولا بنایا اور اسے ہاتھوں سے تول کر پُر اطمینان لہجے میں بولے: ''ایسے دو ایک آدمی روز آتے رہیں، تو کیوں مودی اور گوالے اور کوٹھی والے کی لتاڑ سہنا پڑے۔''

آج سشن جج نے ایک معرکتہ الآرا مقدمہ کی تجویز سنائی تھی اور ایک متمول خاندان کی نوجوان بیوہ ہرنام دیوی کو دو سال کی سزا دی تھی۔ معلوم نہیں مقدمہ کی اصلیت کیا تھی۔ زبان خلق کچھ کہتی تھی، تجویز مقدمہ کچھ، لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ کچھ حسن و عشق اور رشک و رقابت کا معاملہ تھا۔ داروغہ جیل اور وارڈر اور ڈاکٹر پھولے نہ سماتے تھے۔ آج سونے کی ایک چڑیا ان کے ہاتھ لگی تھی۔ اسی کے قدموں کی برکت تھی کہ آج کہیں بھنگ کے گولے تھے کہیں افیون کی چسکیاں اور کہیں مے ناب کے دور!

(2) تین دن گزر چکے۔ دس بجے رات کا وقت تھا۔ الہٰ آباد جیل کے دروازے پر برقی لالٹین روشن تھی۔ کارے سنگھ اور رستم خاں وردیاں پہنے سنگینیں لیے پہرہ دیتے تھے۔

رستم خاں نے بندوق پٹک کر کہا: ''اس نوکری سے ناک میں دم آگیا۔ یہ مزے کی میٹھی نیند سونے کا وقت ہے یا کھڑے کھڑے قواعد کرنے کا۔''

کارے سنگھ کا دھیان کسی دوسری طرف تھا۔ یہ بات کان میں نہ پڑی دفعتاً رستم خاں کے پاس جاکر بہت رازدارانہ لہجے میں بولے: ''یار تم سے ایک بات کہوں؟ پیٹ کے ہلکے تو نہیں ہو، جان جوکھم ہے؟

رستم خاں نے پر یقین انداز سے پوچھا: ''کیا مجھ پر بھی اعتبار نہیں ہے۔ آزما دیکھو۔

کارے سنگھ کو یقین آگیا۔ بولے تین دن سے روز اس وقت جیل کے اندر سے کوئی میرے پاس کاغذ کے پرزے پھینک دیا کرتا ہے۔ بس ایک ٹھیکرے میں لپٹا ہوا میرے سامنے ہی آکر گرتا ہے اور مضمون سب کا ایک۔ یہ دیکھو۔

رستم خاں نے حیرت آمیز اشتیاق کے ساتھ پرزوں کو لیا اور بہت آہستہ آہستہ پڑھنے لگے۔ ''ٹھاکر کارے سنگھ کو ہرنام دیوی کا بہت بہت پیار۔ اگر 20 ہزار نقد، پانچ ہزار کا زیور اور ایک محبت سے بھرا ہوا دل لینا ہو تو مجھے یہاں سے کسی طرح نکالو۔ بس زندگی کی آس تمھی سے ہے۔''

رستم خاں کو رشک ہوا۔ یہ کچھ ایسا گبھرو جوان تو نہیں ہے۔ ہاں ذرا رنگ صاف اور بدن سڈول ہے، بولے:

''یار تمھارے نصیب تو جاگتے ہوئے نظر آتے ہیں۔''

کارے سنگھ نے گرمجوشی سے کہا: ''جاگیں گے تو ہم دونوں کے نصیب ساتھ ہی جاگیں گے۔''

رستم خان نے سچی ہمدردی اور حوصلہ افزائی کی نظر سے دیکھا۔ رشک غائب ہوگیا، بولے: ''تم سے مجھے یہی۔ امید ہے۔ میں تمھارے ساتھ سر دینے کو تیار ہوں۔''

دونوں دوست باہم سرگوشیاں کرنے لگے۔ ان پرزوں کے متعلق جو شکوک پیدا ہوسکتے تھے وہ پیدا ہوئے۔ کوئی دھوکا فریب تو نہیں۔ شاید کسی حریف کی شرارت ہو۔ کسی بدخواہ نے یہ جال بچھایا ہو۔ لیکن عورت کا کیا اعتبار! کہیں دھوکا دے تو اپنا کام نکال کر دھتکار بتادے۔ اسے ایسے سیکڑوں آدمی مل سکتے ہیں۔ پھر اسے نام کیونکر معلوم ہوا۔ ضرور کسی دغاباز کی شرارت ہے۔ لیکن رستم خاں نے اپنی پرزور دلیلوں سے یہ سارے شکوک رفع کردیے۔ دھوکا فریب کچھ نہیں۔ اس کا دل تم پر آگیا ہے۔ تم جیسا بجیلا جوان ساری دنیا میں نہیں ہے۔ چاہے شرط بدلو، کوئی بات نہیں۔ اس کی نگاہ تم پر پڑی اور ریجھ گئی اور نام کا کیا کسی سے پوچھ لیا ہوگا۔ حسین عورت ہے لاکھوں کا کاروبار ہے۔ اور بالغرض دھتکار ہی بتادے، دو چار مہینے تو اس کی صحبت کا لطف اٹھاؤ گے۔ اتنے دنوں میں تو مالا مال ہوسکتے ہو، چاہے سونے کی دیواریں بنوالو۔ کارے سنگھ کی نگاہوں میں رستم خاں اس وقت ایک نہایت آزمودہ کار، ذی فہم اور وفاشعار دوست معلوم ہوتا تھا۔ اس کے سارے شکوک مٹ گئے۔ التجائی انداز سے بولا: ''تو تمھاری یہی صلاح ہے؟ رستم خاں نے مستقل آواز سے کہا: ''ہاں''

کارے سنگھ: کچھ آگ پیچھ نہ کریں؟

رستم خاں: ''آگ پیچھ کرکے پچھتاؤ گے۔ موتی ڈوبنے ہی سے ملتا ہے۔''

(3) یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ دونوں سپاہیوں کے سامنے ایک ٹھیکرا کاغذ میں لپٹا ہوا آکر گرا۔ رستم خاں نے دوڑ کر اٹھالیا۔ یہ افیون کی ترنگ ہو یا ترقی کی جانب سے مایوسی۔ باوجودیکہ اس معاملے میں اس کی حیثیت محض ایک مشیر اور ہمدرد کی تھی لیکن جوش اور حوصلے میں وہ اصل ہیرو سے کئی قدم آگے تھا۔ پرزہ کھول کر پڑھنے لگا۔ ''جواب کا انتظار ہے۔ میں یہاں باغیچے میں کھڑی ہوں۔''

بارود میں آگ لگ گئی۔ ضبط اور اخلاق کی دیوار تو خیر کمزور تھی، خوف کی مضبوط اور سنگین دیوار بھی ہل گئی۔ رستم خاں نے وہ سوال کیا جس کا صرف ایک ہی جواب ہوسکتا تھا۔ ''اب؟

کارے سنگھ نے بزدلانہ لہجے میں کہا: ''میں بھی تمھارے ساتھ ہوں۔''

لیکن جب کارے سنگھ زینہ لانے کے لیے چلا تا کہ احاطہ کی اونچی دیوار پر چڑھے تو اس کے ہاتھ اور پیر تھر تھر کانپ رہے تھے۔ قول کے ہوائی احاطے سے نکل کر اب وہ عمل کے دروازے پر کھڑا تھا اور سوچ رہا تھا کہ زینہ کو اٹھاؤں یا نہ اٹھاؤں، اگر کوئی دیکھ لے کسی دوسرے سپاہی کی نظر پڑ جائے یا رستم خاں ہی دغا کر بیٹھے تو جان آفت میں پھنس جائے۔ اس حیص بیص میں اسے دیر ہوئی تو رستم خاں لپکتے ہوئے آئے اور کسی قدر واعظانہ درشتی سے بولے: ''یہاں کھڑے کھڑے زینہ کے نام کو رو رہے ہو کیا؟ چوڑیاں کیوں نہیں پہن لیں؟ کارے سنگھ نے ندامت سے سر جھکا کر جواب دیا: ''بھئی یہ کام میرے بوتے کا نہیں، میں کیا کروں۔'' رستم خاں ان سریع الاعتقاد آدمیوں میں تھا، سر تسلیم ہوتا ہے مگر دلیلیں نہیں ہوتیں، بولا: ''اچھا ہٹو میں ہی لے جاتا ہوں۔''

یہ کہہ کر اس نے لمبی سیڑھی کو کندھے پر اٹھایا اور لا کر اسے جیل کی دیوار سے کھڑا کر دیا۔ اب ہفت خواں کی پہلی اور دشوار منزل درپیش ہوئی۔ زینہ پر چڑھ کر اندر کون جائے۔ کارے سنگھ جانتا تھا اگر میں نے ذرا بھی تامل کیا تو رستم خاں کے قدم زینہ پر ہوں گے۔ اور تب سہرا بھی اسی کے سر ہوگا جو رازداں تھا وہ رقیب بن جائے گا۔ رستم خاں کی زندہ دلی نے کچھ اسے بھی گرمایا۔ زینہ پر چڑھا لیکن اس طرح گویا کوئی سولی کے تختہ پر لیے جاتا ہے۔ ہر ایک قدم کے ساتھ دل نیچے بیٹھا جاتا تھا اور بڑی مشکل سے زینہ کے ڈنڈوں پر پیر جمتے تھے۔ ضمیر کی آواز عرصہ ہوا بند ہو چکی تھی۔ لیکن سزا کا خوف باقی تھا۔ مچھر کے ڈنک سے انسان بے حس ہو سکتا ہے لیکن کون ہے جو تیز بھالے کے سامنے سپر ہو جائے گا۔ کارے سنگھ پچھتاتا تھا اور اپنے تئیں کوستا تھا کہ ناحق بیٹھے بٹھائے اپنی جان آفت میں پھنسائی۔ معلوم نہیں صبح کو کیا گل کھلیں گے اور یہ یقینی امر تھا کہ اگر رستم خاں نیچے نہ کھڑا ہوتا تو وہ بخیر و عافیت اتر آنے کے لیے دیوتاؤں کی منوتیاں کرتا۔ اس طرح مچلتے اور ہچکتے اس نے آدھی منزل طے کی۔

(4) آدھا راستہ طے کرنے کے بعد کارے سنگھ کو ایک طرح کی جولانی محسوس ہوئی۔ جولانی کیا تھی توکل کی ہمت تھی۔ اس نے تیزی سے قدم اٹھائے اور آن کی آن میں جیل خانہ کی دیوار پر تھا۔ وہاں پہنچتے ہی اس نے دوسری جانب نگاہیں دوڑائیں اور اس کے دل و جگر میں گدگدی ہوگئی۔ ہر نام دیوی ایک روش میں کھڑی اپنی طرف بلا رہی تھی۔ یہ لکھنا کہ کارے سنگھ کس طرح اپنے صافے کو زینہ کے ایک ڈنڈے سے باندھ کر نیچے اتر گیا اور وہاں اس نازنین نے اس سے رازو نیاز یا عشق و محبت کی باتیں کیں، باہم کیا کیا عہد و پیمان ہوئے اور پھر کس طرح وہ اسے دیوار کے اوپر لایا، یہ ایک طول طویل داستان ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ کارے سنگھ نے وہی کیا جو ہر ایک منچلا عاشق ایسی حالت میں کر سکتا تھا۔ ہر نام دیوی کو طول و عرض سے کافی وافی حصہ ملا تھا۔ اور کارے سنگھ نے جب اسے اپنی پیٹھ پر لادا کہ چوڑی موری کو عبور کرے تو اس کی کمر ٹوٹی جاتی تھی۔ حسینہ نے آسن بھی ایسی خوبصورتی سے جمایا تھا گویا کوئی شہسوار ہے، مگر کارے سنگھ نے یہ مصیبتیں خندہ پیشانی سے جھیلیں۔ یہ سب عشق کے تبرکات ہیں۔ حرف شکایت زبان پر نہ لایا۔ ہاں دل سے مجبور تھا۔ اس طرح جب گھنٹہ بھر کی جان کاہی کے بعد پھر رستم خاں کے پاس آیا تو دم پھول رہا تھا اور سارا بدن پسینہ میں شل تھا۔ رستم خاں نے اسے گود میں اٹھا لیا اور ہر نام دیوی سے بہت مودبانہ لہجے میں کہا: ''بائی جی اس غلام کا بھی خیال رہے۔''

(5) وقت نہایت بیش قیمت تھا۔ ہر نام دیوی برگد کی آڑ میں کھڑی ہوگئی۔ دونوں سپاہیوں نے چٹ پٹ وردی اتار پھینکی اور تب رستم خاں نے دوسرے سپاہی کو جگا کر پہرہ بدلا۔ یہ ایک پہاڑی تھا، بہت غرّایا کہ ابھی بارہ نہیں بجے ابھی سے دق کرنے لگے۔ لیکن رستم خاں کی منت و سماجت نے اسے ٹھنڈا کیا۔ ادھر وہ پہرہ پر آیا۔ ادھر یہ تینوں آدمی شہر کی طرف چلے۔ ہر نام دیوی نے سبزی منڈی کا پتہ دیا تھا۔ آگے آگے رستم خاں کندھے پر بندوق رکھے فاخرانہ انداز سے چلے جاتے تھے، گویا کوئی معرکہ جیت کر آئے ہیں۔ بیچ میں ہر نام دیوی تھی، شرمیلی اور متی (کذا)...کارے سنگھ سب سے پیچھے تھے۔ خاموش متفکر اور خائف۔ قدم قدم پر کھٹکا ہوتا تھا کہ کہیں سپاہیوں کی فوج پیچھے نہ آتی ہو۔ اس طرح قریب نصف میل چلنے کے بعد پختہ سڑک ملی۔ ہر نام دیوی ایک ٹھنڈی سانس لے کر بیٹھ گئی اور بولی کہ اب مجھ سے نہیں چلا جاتا میرے پاؤں من من بھر کے ہو گئے۔ ایک یکہ لاؤ۔ رستم خاں بہت نادم ہوئے کہ یہ تجویز ان کی جانب سے ہونی چاہیے تھی۔ اپنی غلطی پر متاسف ہوئے اور تب بندوق کارے سنگھ کے سپرد کر کے یکہ کی تلاش میں چلے۔ آدھی رات تھی۔ چاندنی چھٹکی ہوئی سبزہ زار کا فرش آنکھوں لبھانے والا۔ درخت کا ٹھنڈا سایہ روپہلے پھولوں سے آراستہ۔ ساری فطرت نغمہ اور نشاط کے نشے میں متوالی ہو رہی تھی۔ یہ قدرتی بات تھی کہ کارے سنگھ کے دل میں عاشقانہ جذبات جوش پر آئیں۔ ہر نام دیوی نے ایک دلفریب ادا کے ساتھ اس کے دونوں ہاتھ پکڑ لیے اور بولی یہ بہت شرارت کرتے ہیں، میں انھیں باندھ دوں گی۔

کارے سنگھ کو مٹکے بھر بھنگ کا نشہ تھا دل زلفوں میں الجھ چکا تھا۔ گردن میں وفا کی رسی پڑی ہوئی تھی۔ سارا صفا ختم ہو گیا۔ ہر نام دیوی پھندے لگاتے لگاتے تھک گئی لیکن وہ اپنی مستانہ ترنگ میں ان شیریں اداؤں کی بہار لوٹتا رہا۔

تب اس کی آنکھوں کے سامنے سے طلسم کا پردہ اٹھا۔ ہر نام دیوی نے ساڑی اتار پھینکی اور اس کے بجائے ایک گٹھیلا بڑی بڑی مونچھوں والا جوان ہاتھ میں بندوق لیے کھڑا نظر آیا۔ ایک پانچ ہاتھ کی ساڑی انسان کو کتنا دھوکا دے سکتی ہے۔ کارے سنگھ نے پیر پٹک کر کہا: ''ارے گھاسی رام!''

اسی اثنا میں رستم خاں یکہ لاتے ہوئے دکھائی دیے۔ گھاسی رام نے وہ ساڑی اٹھا کر کارے سنگھ کو اڑھادی اور بولا یہ تمھاری ہر نام دیوی تمھارے سپرد ہے۔ اس کے بدلے میں مجھے یہ بندوق دے دو۔ اب میں چلتا ہوں۔ میرا قصور معاف کرنا۔

کارے سنگھ نے فریاد مچائی۔ لیکن گھاسی رام لاپتہ ہو چکا تھا۔ رستم خاں پر اس سانحہ کا جو کچھ اثر ہوا وہ محتاج بیان نہیں۔ امیدوں سے بھرے ہوئے بیٹھے خواب پریشاں ہوگئے۔ اس رازداری وکوشش و ہمدردی کا صلہ یہ ملا کہ کارے سنگھ نے سارا الزام اس کے سر رکھا اور جب وہ اپنی صفائی دینے لگا تو غریب کو ایسی پٹخنی دی کہ اس کی کلائی ٹوٹ گئی۔

اسی رات کو شہر میں دو مسلح ڈاکے پڑے۔ روزانہ اخباروں نے لکھا کہ مشہور ڈاکو گھاسی رام الہ آباد جیل سے نکل بھاگا ہے۔ اور گردونواح میں ڈاکہ اور لوٹ کی گرم بازاری ہے۔

□□□

پتہ:
46-B,
New Mandi,
Muzaffar Nagar-251001 (U.P.)

فورٹ ولیم کالج کے نسخۂ کلیات میر (مطبوعہ 1811) کے بعد کلام میر کا صحیح ترین اور مکمل ترین نسخہ

کلیات میر (دو جلدوں میں)

جلد اول (مکمل چھ دیوان غزلیات) صفحات: 870 ● قیمت 402 روپے مجلد، 336 روپے غیر مجلد ● سائز: 20X26X8

مرتب: ظل عباس عباسی ● بہ تصحیح و اضافہ: احمد محفوظ ● زیر نگرانی: شمس الرحمٰن فاروقی

جلد دوم (قصیدہ، مثنوی، مرثیہ وغیرہ) صفحات: 632 ● قیمت 430 روپے مجلد، 410 روپے غیر مجلد

تحقیق و ترتیب: احمد محفوظ ● زیر نگرانی: شمس الرحمٰن فاروقی

- اس نسخے کو تمام اہم اور قابل ذکر مطبوعہ نسخوں کو سامنے رکھ کر تیار کیا گیا ہے اور بقدر ضرورت قلمی نسخوں سے بھی مدد لی گئی ہے۔
- کلام میر میں مستعمل بے شمار نادر اور نامانوس الفاظ کی صحت و درستی کو بڑی حد تک یقینی بنایا گیا ہے۔
- نسخۂ عباسی جو صرف غزلیات پر مشتمل تھا اس میں نسخۂ محمود آباد سے بہت سارا کلام لے کر اضافہ کیا گیا ہے۔ اس طرح اب جلد اول میں غزلیات کی کل تعداد 1916 ہے جو ابھی تک کے تمام مطبوعہ نسخوں سے زیادہ ہے۔ غزلیات میں اشعار کی کل تعداد 13908 ہے۔
- جلد دوم میں میر کے تمام مرثیوں کو پہلی بار پوری صحت کے ساتھ مکمل صورت میں سامنے لایا گیا ہے۔
- جلد دوم میں منظومات کو پہلی بار بالکل نئی، مناسب اور بااصول ترتیب سے رکھا گیا ہے۔ اس طرح نسخے میں شامل کسی بھی منظومے کو تلاش کر لینا آسان ہو گیا ہے۔
- دونوں جلدوں میں متن کی تصحیح کے دوران مختلف مستند اور بعض نادر لغات اور فرہنگوں کا سہارا لیا گیا ہے۔
- جلد دوم میں دو تفصیلی دیباچے شامل ہیں۔ احمد محفوظ کے دیباچے میں کلام میر کی تدوین و تصحیح متن سے متعلق نہایت اہم امور زیر بحث لائے گئے ہیں۔ شمس الرحمٰن فاروقی کے دیباچے میں مثنویات میر اور میر کے عمومی کلام پر ایک بالکل نئے پہلو سے گفتگو کی گئی ہے۔
- جلد اول میں دیگر مضامین کے علاوہ شمس الرحمٰن فاروقی کا دیباچہ نما ایک نیا مضمون ''تمہید'' کے عنوان سے شامل ہے۔
- ان دونوں جلدوں کو بڑے سائز پر سفید کاغذ اور عمدہ کمپوزنگ کے ساتھ شائع کیا گیا ہے اور سرورق ایسا ہے جو میر کے زمانے کی تہذیبی و ثقافتی روایت کی عکاسی کرتا ہے۔

کلیات میر (جلد اول و دوم) ملک کے تمام بڑے کتب فروشوں کے یہاں دستیاب ہے۔ اردو کونسل سے براہ راست بھی طلب کی جا سکتی ہے۔

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک-1، آر.کے. پورم، نئی دہلی-110066

سید اطہر رضا بلگرامی

ہندوستان کے لوک گیتوں میں 1857 کی جھلکیاں

ہندوستان کے لوک گیت عوام کی زندگی اور ان کی معاشرت کا آئینہ ہیں۔ ان گیتوں کی زبان خواہ کتنی ہی کھردری اور غیر ادبی کیوں نہ ہو، ان میں عوام کی سماجی، معاشی، سیاسی اور اعتقادی زندگی کی حقیقی تصویریں نظر آتی ہیں۔ برٹش حکمرانوں کے استبداد، استحصال اور عیاری، ان کے خلاف عوام میں نفرت، غم وغصہ، احتجاج اور پھر معاشرے کی اپنی کمزوریاں ان سب کو ان گیتوں نے موثر ڈھنگ سے پیش کیا ہے۔

تاریخ واقعہ اور اس کے اسباب بیان کرتی ہے اور واقعے سے وابستہ نمایاں کرداروں کا ذکر کرتی ہے لیکن لوک گیت واقعہ، اسباب اور کرداروں تک محدود نہیں رہتے۔ وہ اس واقعے سے سماج کے مختلف طبقات پر پڑنے والے اثرات کا بھی بیباکانہ بیان کرتے ہیں۔ وہ ان غیر معروف واقعات اور کرداروں کو تاریخ کا حصہ بنا دیتے ہیں جو مورخ کی نگاہ میں زیادہ اہمیت کے حامل نہیں ہوتے۔

تاریخ اپنے عہد کے حکمرانوں کی زبان اور ان کی فکر ہوا کرتی ہے۔ برطانوی عہد میں لکھی گئی تاریخیں انھی کے ذہن اور انھی کی پالیسیوں کی ترجمان تھیں۔ اس لیے فوجی بغاوت کو نافرمانی کے ہی رنگ میں دیکھا گیا۔ عوامی شورشوں کو کچلنے اور بے اثر بنانے کے اقدامات کو تو بیان کیا گیا لیکن عوام کے مجاہدانہ کارناموں، ان کے مصائب و آلام اور جذبۂ حریت کو نظر انداز کیا گیا یا انتہائی ہلکا بنا کر پیش کیا گیا۔ اگر کسی حق پرست نے حقائق بیان کرنے کی جرأت کی تو حکومت نے اس کو قابلِ سزا قرار دیا، ایسی تمام تحریریں ضبط ہوئیں، ان کے لکھنے والوں پر مقدمے چلے اور انھیں سزائیں دی گئیں۔ خاندان کے افراد پر کیسی مصیبتیں نازل ہوئیں، انھوں نے کس طرح صبر وشکر کے ساتھ ان کو جھیلا، کیسی ہمت و جواں مردی کا مظاہرہ کیا۔ یہ تفصیلات تاریخ میں نہیں ملتیں۔ یہ لوک گیت ہیں جنھوں نے ہر حقیقت کو بے نقاب کیا اور عوام کے مجاہدانہ جوش و خروش کو تقویت بخشی۔

لوک گیتوں میں گدیوں کے ''چھکرے''، دھوبیوں کے ''لاؤنی'' اور ''پھٹکے''، اناج پیستے وقت کے ''جانت گیت''، کھیتوں میں نرائی کرتے وقت کے ''نرائی گیت'' انگریز حکمرانوں کے جبر وتشدد کی داستانوں اور اس کے خلاف عوام کی نفرت اور ان کے جذبۂ حریت سے پُر ہیں۔ گدیوں کا ایک گیت دیکھیے جو ''چھکرا'' کے انداز کا ہے اور جس کی ٹیک ہے:

تال تلیاں پٹ پٹ گئیں
بھر گئیں چیلاں کی کوئیاں
لال فرنگی کرچ دکھاویں
گھونگھٹ والی نہوڑی پڑی پیاں

اس طرح کے واقعات کی تائید ظہیر دہلوی کی آپ بیتی سے بھی ہوتی ہے جو ''نقوش آپ بیتی نمبر'' میں شائع ہو چکی ہے۔ وہ لکھتے ہیں: ''جو لوگ شہر میں رہ گئے تھے ان میں کئی اشخاص باکمال ''فردِ روزگار مارے گئے۔ عورتوں کا یہ حال تھا کہ گھروں سے نکل نکل کر بچوں سمیت کنوؤں میں جا گریں۔ چیلوں کے کوچے کے تمام کنویں لاشوں سے پٹ گئے...'' گیت کار نے شرفا گھرانے کی خواتین جو اس کی نگاہ میں ''گھونگھٹ والی'' تھیں، ان کے حالِ زار کا نقشہ کھینچا ہے۔

لوک گیت عوام کی معاشرتی زندگی کے ایک، ایک پل کے عکاس ہیں سپاہیوں کی غارت گری اور دہشت انگیزی سے اور روزمرہ کے کام کس طرح متاثر ہوئے اور لوگ کس خوف و دہشت میں مبتلا رہے اس گیت میں ایک جھلک دیکھیے، ''ایک ادھیڑ عمر کی ساس اپنی نوجوان بہو سے مخاطب ہو کر کہہ رہی ہے:

بہو جلدی جلدی دھان کوٹ لے
کہیں تلنگے نہ گھس پڑیں
میں بنیے کی دکان دیکھتی ہوں
دال، لہسن اور زیرہ لے آؤں
کواڑ بند کر لینا کہیں ایسا نہ ہو
کہ تلنگے اور گورے گھس پڑیں''

انگریز سپاہیوں نے محض گھروں کو نہیں لوٹا، اِملاک کو تباہ نہیں کیا بلکہ ہندوستانی معیشت کی ریڑھ کی ہڈی زراعت کو بھی اپنی بربریت کا نشانہ بنایا۔ کھڑی فصلوں کو آگ لگائی، اناج لوٹا اور کسانوں کو زدوکوب کیا۔ یہ بغاوت کچلنے کا موثر معاشی حربہ تھا جس سے نہ صرف کسان طبقہ بے دست و پا ہوا بلکہ پوری معیشت متاثر ہوئی۔ کھیتوں میں نرائی کرتے وقت عورتیں بہت اداس ہیں۔ کہتی ہیں:

''نریا ماں من نہ لاگے سجنوا
پکی، پکی فصل کمپنی کے دلال کاٹ لیں گے
اور کھیتوں میں آگ لگا دیں گے
پھر ہم بھوکوں مر جائیں گے''

انگریزوں کی لوٹ مار سے معاشی بدحالی مختلف شکلوں میں رونما ہوئی۔ لوک گیتوں نے ان کی بھرپور عکاسی کی۔ ایک گیت میں معاشی بدحالی کی نوعیتیں دیکھیے:

''پیسے سیر کی دال بکائی آنے سیر... یہ دیکھو اندھیر
بھوکے پیاسے بچے رووِیں، مائیں پیٹیں چھاتی
گھروں میں گھس گھس گورے آویں جیسے ہوں براتی... یہ دیکھو اندھیر
شال دوشالے جو اوڑھے تھے ان کو کپڑا نہیں میسر... صرف لگائیں گھاتی
پیسے سیر کی دال، بکائی آنے سیر... یہ دیکھو اندھیر''

لوک گیتوں نے محض انگریزوں کے ظلم و جارحیت اور لوٹ مار کی تصویریں ہی پیش نہیں کیں، صرف عوام کی مصیبتوں، اذیتوں اور تکلیفوں کو ہی بیان نہیں کیا بلکہ ان کے خلاف عزمِ جہاد، ایثار و اتحاد کی بھرپور عکاسی بھی کی ہے۔ ایک گیت دیکھیے جس میں طنز بھی ہے، نفرت بھی ہے اور بے بسی بھی ہے۔ یہ گیت میرٹھ کے مشہور سور کی چربی لگے چمڑے کے کارتوسوں کو دانتوں سے کاٹنے کے خلاف فوجی بغاوت کی حمایت میں ہے:

''چار ٹکے پر نوکر رکھ کے دین ایمان مٹاویں
دانتوں سے کرتوس تڑاویں، چربی سور کھلاویں
چار ٹکے پر نوکر رکھ کے دین ایمان مٹاویں
بھوسا گھاس بیچ بیچ کے بن گئے شاہ فرنگی
بن گئے شاہ فرنگی! بھائی دیکھو وقت کی بلہاری
محلوں کی رہنے والی پھریں بجار (بازار) بچاری
چار ٹکے پر نوکر رکھ کے دین ایمان مٹاویں
گورے بندر تن، تن کے شہزادوں کو ناچ نچاویں
چار ٹکے پر نوکر رکھ کے دین ایمان مٹاویں''

بہار میں بھوج پوری زبان میں یہی واقعہ راجہ کنور سنگھ کے حوالے سے ہے۔ کنور سنگھ نے اپنے بھائی امر سنگھ کو خط لکھ کر مطلع کیا کہ اے بھائی سنو چمڑے کے کارتوس دانت سے کاٹنے پر ہمارا چھتری دھرم نشٹ ہو رہا ہے اور دونوں بھائیوں نے انگریزوں سے لڑائی کی ٹھان لی۔

سیاسی حالات کی بہترین تصویرکشی ''ساکھا'' میں ملتی ہے۔ یہ ساکھے ''عوامی رزم نامے'' ہیں جن میں انگریزوں کے جبر و تشدد، غارت گری، عیاری اور استحصال کی منظرکشی کی گئی ہے۔ یہ ساکھے اب نایاب ہیں۔ صرف ایک ''ساکھا'' جو بخو خاں کے نام سے منسوب ہے، دستیاب ہے۔ یہ ساکھا نیا دور لکھنؤ 1971 میں شائع ہو چکا ہے۔ اظہر علی فاروقی صاحب نے اپنی کتاب: ''اتر پردیش کے لوک گیت'' میں بھی یہ ساکھا شائع کیا ہے۔ یہ ساکھا کافی طویل ہے۔ اس ساکھے میں رامپور اور بریلی کے روہیلوں کی انگریزوں کے خلاف بغاوت اور جنگ کی منظرکشی کی گئی ہے۔ اس لڑائی میں بخو خاں مارے گئے لیکن انھوں نے بھی بہت سے فرنگیوں کو مارا۔ ایک لنگڑے فرنگی نے سِکّے بکھیر دیے جن پر روہیلے ٹوٹ پڑے۔ بخو خاں اکیلے رہ گئے، ان کے گولا لگا اور وہ شہید ہو گئے۔ اس ساکھا کا اختتام اس طرح ہوتا ہے:

''سنکھیا ندی پہ بخو خاں نے مارے
ایک فرنگی لنگڑا رہ گئیو اس نے مہریں بہت بکھیریں
روہیلے ٹوٹے مہرن پہ نباب (نواب) رہ گئے اکیلے
بخو خاں کے گولا لا گو دلیر خاں کی کانی (یعنی سستی کی وجہ سے)
جیتی لڑائی بخو خاں ہارے
سمرو (یاد کرو) سیتارام کو''

اسی طرح کا ایک گیت رانا بینی بہادر جاگیردار کی ستائش میں ہے جس نے اپنی جاگیر کی رعایا کو جمع کیا اور انگریزوں کو للکارا۔ انگریزوں کے ایک صوبہ دینے کی پیشکش کے باوجود جاگیردار اس فریب میں نہیں آیا اور کہا:

''مجھ میں جب تک دم ہے تم جان لو کہ میرا عزم یہ ہے
کہ تمھاری جڑیں کھود ڈالوں اور تمھیں باہر نکال پھینکوں
تمام زمیندار متحد ہیں
اور انگریز ان کے سامنے خوف و ہراس سے کانپ رہے ہیں''

لیکن گیت کار نے آخر میں یہ انکشاف بھی کر دیا:

''پھوٹ ان کو ایک دوسرے سے جدا کر دے گی
اور ان کے قلعے کی بنیادیں تباہ کر دے گی''

(ترجمہ)

دلّی اور غازی آباد کے درمیان ''ہنڈن'' ندی آج بھی موجود ہے۔ اس ندی کے کنارے کپتان سنڈرسن اور سپہ سالار عظیم اللہ خاں کی فوجوں کے درمیان جنگ ہوئی۔ حکیم احسن اللہ خاں کی فوجی کمک انگریز فوج سے جا ملی۔ نتیجے میں عظیم اللہ خاں کو شکست ہوئی۔ ایک ساکھے میں یہ پورا واقعہ موجود ہے جس کی ٹیک ہے:

''ہنڈن ندی کے پار اترنا مشکل ہے سرکار''

ایک گیت میں ''چرتلا'' کے میدان کا ذکر بڑے جوش و خروش سے کیا گیا ہے: ''ہم تو چلے چرتلا کے میدان۔'' اس گیت میں اس ٹیک کو مختلف صورتوں میں بہت خوبصورتی سے دہرایا گیا ہے۔ یہ میدان اتر پردیش ضلع ہردوئی کے قصبہ پہانی کے اتر پورب تقریباً سات، آٹھ کیلومیٹر کی دوری پر واقع ہے جہاں لڑائی ہوئی تھی۔ جہان خاں اور صلابت اللہ خاں یہ دو بااثر شخصیتیں تھیں جنھوں

نے انگریزوں سے مورچہ لیا۔ ان کی تمام رعایا نے ساتھ دیا:

''ہم تو چلے چہرتلا میدان
دھوتو، دھوتو، نگاڑا باجے
دوڑ، دوڑ تلنگے ساجے
تروجی کی آواز سنو
گوری اب تو ہم کو نہ روکو
رن پڑا گھمسان
ہم تو چلے چہرتلا میدان
جہان خاں نے ہونکا لگائی
رن بیچ جن کی دیں دہائی
انھیں سے سب نے آس لگائی
جمع ہوئے سب جوان
ہم تو چلے چہرتلا میدان
ٹھائیں ٹھائیں بندوقیں گرجیں
کڑ، کڑ، کڑ، کڑ کریں تلوار
میدان میں کودے صلابت اللہ
اور فرنگی ہوئے پریشان
ہم تو چلے چہرتلا میدان''

لوک گیتوں میں جھانسی کی رانی اور اس کے توپچی غلام غوث خاں اور قلعے کے دربان خداداد خاں کی قربانیوں کا ذکر ملتا ہے۔ انھوں نے معمولی معمولی چیزوں سے ہتھیار بنا کر اپنے آپ کو لیس کیا اور انگریزوں کے خلاف جہاد کیا:

''خاک و سنگ سے اس نے فوج بنائی
محض چھڑیوں سے تلواریں تیار کیں
اس نے پہاڑ کو گھوڑا بنایا
اس طرح اس نے گوالیار کی طرف کوچ کیا'' (ترجمہ)

جھانسی کی رانی کو جب شکست ہوئی تو اس نے جالون اور کالپی کے درمیان تمام درختوں کو کاٹنے کا حکم دے دیا کہ انگریز فوج اس کے سپاہیوں کو پھانسی پر نہ لٹکا سکے۔

''درختوں کو گرا دو
رانی جھانسی نے حکم دیا ہے
ایسا نہ ہو فرنگی ہمارے سپاہیوں کو
پھانسی دینے کے لیے لٹکا دیں
بزدل انگریز چلا کر نہ کہہ سکیں
ان کو درختوں پر لٹکا دو
اور جھلستی دھوپ میں
ان کو سایہ نہ ملے (ترجمہ)

انگریزوں کے خلاف خواتین بالخصوص دیہی خواتین میں کیسی نفرت، کیسا جوش و ولولہ موجزن تھا اس کی دو مثالیں دیکھیے:

(1) ''ٹیکا، جھمکا، کنگن، پہنچی سب پر ہے دھتکار
خود جو ہوتا میرے سر پر ہاتھ میں جو ہوتی تلوار
گھوڑے کو ایڑ لگاتی اور پہنچتی میرٹھ بازار
داؤں دکھاتی ایسی بیرن سب رہ جاتے حیران
بیرن تیری لاش پہ بہنا ہو جاتی قربان''

(2) ''خبر کانپور کی میا ہوئی دوانی
نئی نویلی بھابھی کو ہوئی بڑی حیرانی
گلی گلی میں گھوڑے دوڑیں جن پر ناگ سوار
میں باوری جی کی پوڑھی ہاتھ میں لی تلوار
کالے ناگ کچل دیے اور بھگا دیے شیطان
لڑکی جان کے مجھ کو مرد ہوئے حیران''

ہندوستان کے بیشتر عوام، بالخصوص دیہی عوام مزاجاً صلح پسند، سیدھے سادے، چھل کپٹ جھگڑے فساد سے دور رہنے والے ہیں

ایک لوک گیت میں اس کا اظہار اس طرح ہوا ہے:

''میرٹھ کا صدر بازار ہے یہ
میرا سیّاں لوٹ نہ جانے
لوگوں نے لوٹے تھال کٹورے
میرے سیّاں نے لوٹے گلاس
لوگوں نے لوٹے شال دوشالے
میرے سیّاں نے لوٹے رومال''

انگریزوں کے خلاف جنگ میں مردوں کی قربانیوں نے عورتوں کو کس قدر بے سہارا بنا دیا اس کا شکوہ یوں کیا جا رہا ہے:

''کس پر مجھ کو چھوڑ چلے سیّاں
بھولا جو جھے، تایا جو جھے
جوجھا میرا برنا...... کس کی لوں بلیّاں
کس پر مجھ کو چھوڑ چلے سیّاں''

لیکن یہی عورت مردوں کو دشمنوں سے لوہا لیتے دیکھتی ہے تو اس میں بھی جذبۂ جہاد جاگ اٹھتا ہے:

''توپ چلی بندوق چلی کوٹھلی ہوئی تلوار
گہنا، پاتا نوچ کے پھینکوں بن جاؤں اسوار
سکھی، سہیلی سب کوئی آؤ، آؤ تم بھی گوئیاں
کس پر مجھ کو چھوڑ چلے سیاں''

انگریزوں کے خلاف ہر محاذ پر ہندوستانیوں کو شکست کیوں ہوئی، لوک گیتوں نے اس کے اسباب پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ لڑائی میں توپوں اور بندوقوں کے سامنے تلواروں کے کوٹھل ہونے کا ذکر کیا گیا ہے۔ وہ معاشرتی کمزوریوں کو بھی شکست کا ذمے دار ٹھہراتے ہیں۔ غداری، زمینداروں، جاگیرداروں اور والیانِ ریاست کی عیاشیوں اور برطانوی حکمرانوں سے سازباز کا ذکر بیشتر گیتوں میں ملتا ہے:

''ہمرا بلم جی کا (کو) چار کسم کے جیونا چاہیے
پوری، کچوری، جلیبی، جراجاوا چاہے
حلوہ پوری، پیاجا، مرگ مسلّم ہو چاہے
ہمرا بلم جی کا چار کسم کا بیرا (بیڑا) چاہے
لونگ، الائچی، بحر دا کبام (قوام) جراجاوا چاہے
چانڈو، مدک، افیم اونکا (حقہ) چاہے
ہمرا بلم جی کا چار کسم کے بچیا (سیج) چاہے
توسک، تکیہ، مسہری، گل تکیہ چاہے''

راجستھان کے راجا مہاراجا انگریزوں کا ساتھ دے رہے تھے۔ اس وقت سورج مل ایک درباری شاعر حبِ وطن کے جذبے سے سرشار ہوکر للکارتا ہے کہ یہ بغاوت نہیں، آزادی کی جنگ ہے۔ وہ کہتا ہے:

''سور سبزہ زار کو برباد کرتے ہیں، ہاتھی جھیل کو گدلاتے ہیں
جب کہ شیر خطرے سے غافل ہوکر شیرنی کی محبت میں مست ہے
اے ٹھاکرو! جب تم غیر سے رحم کی درخواست کرتے ہو
تو تم سنگھ یعنی شیر کہلانے کے مستحق نہیں رہتے
صرف وہی اس لقب کے حق دار ہیں جن کے
پنجے ہاتھیوں کو مار گراتے ہیں
اپنے آباو اجداد کے اوصاف سے غافل ہوکر تم غیروں کی اطاعت کرتے ہو
کاہلی اور ناز و نعم میں تم زندگی کے بیش بہا دن کھو رہے ہو
سبحان اللہ کیا شان ہے ان ٹوٹی پھوٹی جھونپڑیوں کی
اور ان کی مٹی کی دیواروں پر اگنے والی گھاس کی
تف ہے والیانِ ریاست کے ان بلند اور فلک بوس محلوں پر
محلات کے لیڈروں کے لیے جھونپڑیاں قہر الٰہی ہیں
اگر وہ جھونپڑیوں کا رخ کریں گے کہ انھیں لوٹا جائے تو
مفت میں وہ موت کے منہ میں چلے جائیں گے (ترجمہ)

ہمارے لوک گیتوں نے تحریک آزادی کے سیاسی اور معاشرتی پہلوؤں کو اجاگر کیا ہے اور ہندوستانی سماج میں پائی جانے والی کمزوریوں اور برائیوں سے بھی پردہ اٹھایا ہے۔ یہ لوک گیت ہی ہیں جنھوں نے تحریک آزادی کے گم شدہ واقعات کو منظرِ عام پر لاکر تاریخ کا حصہ بنادیا۔

حواشی: اس مضمون کی تیاری میں اظہر علی فاروقی صاحب کی کتاب: اتر پردیش کے لوک گیت (ترقی اردو بیورو، نئی دہلی) سے تمام گیت، ترجمے اور واقعات حاصل کیے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ ذیل کی کتابیں بھی مددگار ثابت ہوئی ہیں۔

(1) S.P. Pandey, A.K. Singh, Folk Culture in India, Serial Publication, New Delhi-2005.

(2) P. Chenna Reddy, M. Sarat Babu, Folklore in the New Millenium Research India Press-2004.

(3) نیا دور: انقلاب 1857 نمبر، اپریل، مئی 2007 محکمۂ اطلاعات و رابطۂ عامہ اتر پردیش

□□□

پتہ:
B-40, Johri-Farm,
Noor Nagar Ext..,
Okhla,New Delhi-110025

رام پرشاد بسمل کی آپ بیتی

مرتب: ڈاکٹر وشوامترا اپادھیائے/مترجم: احسان احمد صدیقی

رام پرشاد نے یہ آپ بیتی گورکھ پور جیل میں اپنی پھانسی 19 دسمبر 1927 کے دو دن قبل مکمل کی تھی۔ رام پرشاد بسمل کے سینے میں جو آگ تھی اور جو مقصد پیش نظر تھا اس کا خلاصہ انھوں نے اس آپ بیتی میں بیان کیا ہے جس میں ان کی اپنی مفلوک الحال خانگی زندگی، نامساعد ایام، ایام جوانی، ازدواجی زندگی، والدین اور مذہبی و سیاسی تعلیمات کے ساتھ اپنے اندر پیدا ہونے والے حب وطن کے جذبے کی وجوہات، کاکوری ریلوے ڈکیتی، اپنی گرفتاری، جیل کے واقعات، پھانسی کی کوٹھری اور زندگی کے آخری لمحات کی باتیں بڑی دل خراش ہیں۔

صفحات: 109، قیمت -/33 روپے

سید محمد اشرف

گیا نیشور ملے کی نظمیں

گیا نیشور ملے کی شخصیت اور تخلیقی کارنامے رنگارنگ جہات کے حامل ہیں۔ ان کی خلاقانہ صلاحیتوں نے کئی زبانوں— مراٹھی، ہندی، انگریزی اور اردو میں اپنے جوہر دکھائے ہیں۔ ان کی تصنیفات کا دائرہ— سوانح، شاعری، انشائیے، کالم نگاری اور سفرناموں پر محیط ہے۔ مہاراشٹر سرکار اور دیگر اداروں نے انھیں مختلف اعزازات سے نوازا ہے۔

ان کا ایک تعارف یہ بھی ہے کہ وہ آئی۔ایف۔ایس آفیسر ہیں۔ جاپان، روس، ماریشس اور شام میں سفارت کاری کی خدمات انجام دے چکے ہیں اور فی الوقت کیبنٹ سکریٹریٹ میں صلاح کار اور جوائنٹ سکریٹری کے عہدوں پر فائز ہیں۔

ان کی نظموں کے حوالے سے ان کا تعارف یہ ہے کہ وہ جب کسی ملک میں سفارت کار بن کر جاتے ہیں تو اکیلے نہیں جاتے، سفارت کار کے پردے میں چھپا انسان اور اپنے دل میں بیٹھا شاعر بھی ساتھ ساتھ لے جاتے ہیں۔ اسی لیے یہ دل کو چھو لینے والی، بامعنی نظمیں وجود میں آئیں۔ ملے کا مزاج اردو روزمرہ سے قریب ہے۔ میں نے ان کا ہندی کلام دیکھا ہے اور تازہ مجموعہ بھی جو ''صبح ہے کہ ہوتی نہیں'' کے عنوان سے ابھی حال ہی میں چھپا ہے۔ اس مجموعے میں زیادہ تر الفاظ وہ ہیں جو اردو لغت اور روزمرہ سے قریب ہیں۔

مشرق وسطیٰ خصوصاً فلسطین اور عراق کی زمین کے گہرے دکھ اور اس زمین پر زندگی کرنے والے انسانوں کی محرومیوں، پل پل مرتی زندگی اور ظلم کی آخری حدوں کو پار کر جانے والے بے محابہ انسانی پر کسی ہندوستانی ادیب نے غالباً اتنی تفصیل سے نہیں لکھا ہوگا جتنا اور جیسا گیا نیشور نے لکھا ہے۔ آنکھوں دیکھی کی بات ہی الگ ہوتی ہے۔ تکلیف دہ تماشہ دیکھ کر بھی دکھی ہوا جا سکتا ہے لیکن خود تماشے میں شامل رہ کر تماشہ دیکھنے کی جو اذیت ہوتی ہے اس کا اندازہ ان نظموں کو پڑھنے کے بعد ہی ممکن ہوگا۔ کسی جنگ میں ملے کو گولی نہیں لگی لیکن وہ زخمی ضرور ہوئے ہیں اور یہ نظمیں انھوں نے خون میں ڈوبی انگلیوں سے لکھی ہیں۔ تازہ خون کا رنگ، ذائقہ اور بو کیسی ہوتی ہے، ان نظموں کو پڑھیے، معلوم ہو جائے گا:

اذیت اور موازنہ

اس سرزمین میں
جو میری ہے اور پھر بھی ہے پرائی
اپنی رگوں سے الگ ہو گیا ہے

ہر فلسطینی
یہاں موت ایک ٹائم پاس ہے
جینا ایک غیر معمولی امر
اذیتیں زیتون کے پتوں سے
ان کی جڑ تک پہنچی ہیں
فیصلوں کے برج
روک رہے ہیں
امید اور آس کی
کرنوں کو
اداسیوں کا ایک نیا ریگستان
بنایا جا رہا ہے
یہاں اذیتوں کا موازنہ نہیں ہوتا
ان سے وجود بنتا ہے

مٹی کی نظم

میری مٹھی میں بس مٹی ہے
میری شاعری اس مٹی کی شاعری ہے
انیس سو اڑتالیس
اپنی مٹی سے اکھڑ گیا
اپنی جان لے کر میں حیفہ سے ایکرد
پھر وہاں سے دمشق
فلسطین کی مٹی سے الگ ہوا
تب میں مٹی لے کر بھاگا
فلسطینی ہوا اور بارش نے
جسے چھولیا ہے ایسی مٹی
سفر جاری ہے برسوں کا، دہائیوں کا
مٹی سے مٹی تک پہنچنے کا
مجھے کھینچتے ہیں جافہ کے جھلملاتے چراغ
اور سرحد کے پار چل پڑتا ہوں
مجھے نظر آ رہی ہے موت
لیکن پاؤں تو جمے ہیں مٹی میں

میرے دل کی طرح
جب نکالا گیا تب
ہاتھ میں چابیاں تھیں میرے
گھر کی، دفتر کی
سوچتا ہوں ایک دن اپنے ہاتھوں سے
تالے کھولوں گا
کھلتے دروازوں کی، کھڑکیوں کی آواز سنوں گا
میری رگ رگ میں فلسطین ہے
پھر بھی بھٹک رہا ہوں اس کی تلاش میں
اپنے اس خیمے سے
ڈھونڈ رہا ہوں واپسی کا راستہ
رات دن دیکھتا رہتا ہوں
اولیو کے اجڑتے چمن
خوابوں کی اجڑی وادیاں
یتیم بچے اور
اور فلسطین نام کا قید خانہ
میری چپلیں گھس گئی ہیں
اور ایک میل بھی
نہیں چل پایا ہوں
پچاس سالوں میں

بیت اللحم کی دیواریں

بیت اللحم میں عیسیٰ مسیح
حراست میں لیے جا رہے ہیں
نئی دیواریں بنائی جا رہی ہیں چاروں طرف
بیت اللحم خالی ہو رہا ہے
موقع پا کر لوگ بھاگ رہے ہیں
ادھر دیواریں ہیں ادھر تشدد
ادھر فوجی ادھر خاردار تار
شہر کے دروازے پر
بن رہے ہیں اونچے برج
مسافروں کے بچاؤ کے لیے
جو راشیل کے مقبرے تک جاتے ہیں
اب مقبرے کی چاروں طرف
چڑھ رہی ہیں دیواریں
یہاں ایک نئے سناٹے کی
تعمیر چل رہی ہے
جس سے عیسیٰ مسیح بھی
نہیں بچ پائیں گے
اس چھوٹے بیت اللحم میں
اٹھہتر چوکیاں، تلاشی کے مرکز
دن رات مصروف بکار ہیں
آج کرسمس کا تہوار ہے
بیت اللحم کے راستے کھلے ہیں
مگر نہ انسانی قدم
نہ ہی اس کے قدموں کے نشاں نظر آتے ہیں
ان راستوں پر

رمضان 2004

آج ہمارا رمضان ہے
مگر سن رہے ہیں کہ
ہمیں سبق سکھانے کی
کوئی نئی ترکیب
تلاش رہے ہیں وہ
پانچ دہائیوں میں فلسطینیوں نے
کون سا سبق نہیں سیکھا ہے
پریشان کرنے کا نیا طریقہ کیا ہو سکتا ہے
پانی اور بجلی کاٹیں گے سنا ہے
سنا ہے کہ گولیوں کی برسات ہوگی
ٹینک چلائیں گے اور توپ داغ دیں گے
بھیڑ بھاڑ میں گولی چلا کے
کچھ لوگوں کو مار دیں گے
باقی لوگوں کا پیچھا کریں گے
سچ کہوں تو
اب کسی بات سے
ڈر ہی نہیں لگتا
کیا کریں گے آخر
گھر گرا دیں گے
آسمان سے نشانہ داغیں گے
اور؟ اور؟

موت کی بو چاروں طرف پھیلی ہے
اور ہر شخص قاتل ہے یہاں پر
آج رمضان ہے!

صبح ہے کہ ہوتی ہی نہیں

کوئی بھی نہیں بتا رہا
یہ سفر کب ختم ہوگا
چالیس سال کیا کم ہوتے ہیں
کتنے سال جلاوطن بن کے
رہ سکتا ہے پورا ملک؟
فلسطینی سرزمین مشرقی یروشلم
گولان کی بلندیاں
کھلی ہوا میں سانس لینا چاہتے ہیں سب
درد، بدامنی، قتل، راکٹس، بندوقیں، استحصال، موت
ان کے درمیان کیسے تلاش کر سکتے ہیں امن کی
رہنما مل رہے ہیں
اقوام متحدہ کی تجویز ہے
امن کے نقشے بن گئے ہیں
مگر قدم کیوں ڈگمگاتے ہیں؟
ہر شخص چاہتا ہے ایک راستہ
جو آگے چلے
جس میں بارودی سرنگ نہ ہو
جو امن کا راستہ دکھائے
دو ممالک ہوں جو دوستی میں جئیں
کوششیں بہت ہو چکیں
بیان بازی اور مذاکرات بھی بہت ہو گئے
موت شماری بھی بند ہوگئی بہت پہلے
مگر صبح ہے کہ ہوتی ہی نہیں
مشرق وسطیٰ میں!

وہ دہشت گرد تھے

کوئی کھیت سے چارہ لا رہا تھا
کوئی بچوں کے ساتھ کھیل رہا تھا
کوئی کام کے لیے جا رہا تھا
کوئی کھڑا تھا دہلیز پہ سوچتے ہوئے
ان سب کو پکڑ لیا گیا
کیونکہ وہ دہشت گرد تھے
وہ جیلوں میں رہے سالوں سال
وہاں ان کا ریپ ہوا
بار بار
وہ عام لوگ تھے
عام ہی رہنا چاہتے تھے
مگر وہ پکڑے گئے
کیونکہ وہ دہشت گرد تھے
یہ ہے نجت بیشارہ
خیم جیل میں اس نے دس سال گزارے
چھ سال وہ کسی سے مل نہیں پائی
یہ ہے سلیمان رمضان
حراست میں اس پر گولی چلی
اس کے پاؤں کاٹنے پڑے
کیونکہ ان کا علاج نہیں ہوا
کیونکہ وہ دہشت گرد تھا
ہر ایک کی ایک کہانی ہے
ہر ایک کی ایک درد بھری داستاں
ہر ایک کی ایک نظم ہے
ہر ایک کا ایک ناول
کیونکہ یہ سب دہشت گرد ہیں
ہر کوئی یہی پوچھتا ہے
کیا یادوں کے تئیں ہمارا کوئی فرض ہے؟
کیونکہ یہ کل تک جیل میں تھے
کیونکہ وہ دہشت گرد تھے

گواہتا ناموبے

میں سونا چاہتا ہوں، انھوں نے منع کیا
میں نماز پڑھنا چاہتا ہوں، انہوں نے منع کیا
میں بھوکا رہنا چاہتا ہوں
وہ مجھے کھلانے پر تلے ہوئے ہیں
انھوں نے کیا نہیں بنایا مجھے
نہ مجھے کوئی چاہتا ہے

نہ کوئی مجھ سے پیار کرتا ہے
انھوں نے یہ بھی کہا کہ
جانور بھی مجھ سے زیادہ آزاد ہیں
انھیں مجھ سے زیادہ پیار ملتا ہے
کچھ دن پہلے مجھے وہ چوہے دکھانے لے گئے
چوہے مزے میں کھا رہے تھے
گھوم رہے تھے
کھیل رہے تھے
ایک دوسرے سے پیار بھی کر رہے تھے
میں زور زور سے رونے لگا
وہ زور زور سے ہنسنے لگے
وہ لوگ جو میری تفتیش کرتے ہیں
آج انھوں نے مجھ پر مکھو نے چڑھائے
مکھوٹا لگا کر کمرہ صاف کروایا
سور کی اولاد سور جیسے نہیں رہو گے
چہرے پر مکھوٹا ہاتھ میں ہتھ کڑی
اور صفائی کی سزا
وہ کوڑا میرے منہ پر پھینک رہے ہیں
مجھے بتایا گیا
یہاں پر کتوں کی زیادہ عزت ہوتی ہے
کتے بھلے لوگوں کی حفاظت کرتے ہیں
پھر انھوں نے مجھے کتوں جیسا بھونکنا سکھایا
مجھے اپنے مقام سے بلند کرنا چاہتے تھے
کتوں کی لیول پر لے جانا چاہتے تھے
میں زور زور سے اللہ کو پکار رہا ہوں
وہ چار چار میرے جسم کو کچل رہے ہیں
میرا نام ہے محمد الکلانی
لیکن سب مجھے نمبر تر سٹھ بلاتے ہیں

مرنے والے کی آنکھیں

بغداد میں نہ ہے موت کا نام
نہ ہی مرنے والے کا
یہاں پر ہاتھ میں ہے تصویر
جو غائب ہو گیا ہے
کھو چکا ہے
یا پھر جس کی لاش نہیں مل رہی
ادھر ہر ہاتھ میں تصویر
ادھر مردہ گھر میں پڑی لاشوں کا
کوئی مالک نہیں
بغداد مردوں کا شہر بن چکا ہے
کل کار بم میں اسی مرے
آج اڑسٹھ
ہر روز نئے کھنڈر نیا دھواں
اور نئے بکھرے جسم ہر روز
نئی اور پرانی لاشیں
ہر روز اسپتال آتی ہیں
کچرے کا ڈھیر ہو یا مرغی خانہ
مردہ جسم کہیں پر بھی پائے جاتے ہیں
اب ان چیزوں کی خبر بھی نہیں بنتی
اور چھوٹے پردے تک بھی پہنچتا نہیں کچھ بھی
راستوں میں ارد گرد بکھری لاشوں کا
کون ہے مالک؟
کچھ لاشوں کے ہاتھ بندھے ہوتے ہیں
اور جسم ہوتا ہے حصوں میں بٹا ہوا
سفید کپڑوں سے ڈھکا لاوارث
پورا ملک گزر رہا ہے ایک خوفناک خواب سے
جہاں لوگ ہاتھ میں کسی مردے کی
تصویر لیے گھومتے ہیں
سب کو پتہ ہے کہ کوئی زندہ نہیں ہے
اور مردہ جسم بھی آسانی سے نہیں ملتے ہیں
مگر ڈھونڈتے جا رہے ہیں
مردہ گھر کی کھڑکی سے جھانک رہے ہیں لوگ
اور مردہ گھر کے اندر سے جھانکتی ہیں
مردوں کی آنکھیں
کوئی ایک دوسرے کو پہچان نہیں پا رہا ہے
بغداد اب موت کا دوسرا نام ہے!

□□□

(بشکریہ "آجکل" جون 2008)

اسعد فیصل فاروقی

خلائی سفر کے پچاس سال

(1957 تا 2007)

خلائی دوڑ کی شروعات 4 اکتوبر 1957 کی شام کو ہوئی جب باسکیٹ بال کے سائز کا المونیم کا 84 کلوگرام وزنی گولا اسپتنک ۔ اکا روسی آر-7 بیلسٹک میزائل کے ذریعے لانچ کیا گیا اور جو زمین کے مدار میں گھومنے والا اولین انسانی تیارکردہ سیارچہ بنا۔ صرف نصف صدی کے اندر اندر، انسان نے زمین کے مدار کا طواف کیا، خلا میں چہل قدمی کی اور چاند پر بھی اپنے قدم رکھے۔ آج زمین کے مدار میں 40 سے زائد ملکوں کے ذریعے کنٹرول کیے جارہے 860 سیارچے یعنی سٹیلائٹ چکر لگا رہے ہیں۔ ان میں سے زیادہ تر سیٹلائٹ زمین پر نظر رکھے ہوئے ہیں اور کچھ نے اپنی نگاہیں کائنات کی فراخ وسعت پر مرکوز کر رکھی ہیں۔ ذیل میں پچھلے پچاس برسوں میں خلائی فیلڈ میں ہونے والی دریافتوں بہ اعتبار تاریخ تحریر کیا جارہا ہے۔

4 اکتوبر، 1957: اسپتنک 2، کولائکا کتیا کے ساتھ خلا میں بھیجا گیا، جو خلا میں تیز حرارت اور تناؤ کی وجہ سے خلا میں پہنچتے ہی فوراً ہلاک ہوگئی۔

14 ستمبر، 1959: لونا 2، پہلی خلائی پروب جس نے لونر سرفیس یعنی چاند کی سطح پر امپیکٹ ڈالا۔

12 اپریل، 1961: سوویت خلاباز یوری گگارین خلا میں جانے والے پہلے انسان بنے جب انھوں نے خلائی پرواز کو پورا کیا جو ایک گھنٹہ اڑتالیس منٹ کی تھی۔

5 مئی، 1961: اسٹرونوٹ ایلین شیفرڈ پہلے امریکی خلاباز تھے جنھوں نے مرکری 3 کیپسول کے ذریعے خلا میں 115 میل کا سفر طے کیا۔

25 مئی، 1961: اسٹرونوٹ جان گلین، پہلے امریکی جنھوں نے زمین کے مدار کے چکر لگائے۔

14 دسمبر، 1962: امریکہ نے میریز 2 پروب کو وینس پر بھیجا۔

16 جون، 1963: ویلینٹینا تریشکوا خلا میں جانے والی دنیا کی پہلی عورت بنی۔

26 جولائی، 1963: پہلی جیوسینکرونس سٹیلائٹ سینکام 2 کو لانچ کیا گیا۔ چنانچہ یہاں سے ٹیلی وژن نشریات کے لیے سیارچے کے ذریعے اطلاعات کی ترسیل کی شروعات ہوئی۔

21 نومبر، 1963: تھمبا ایکویٹوریل راکٹ لانچنگ اسٹیشن، کیرالہ سے ہندوستان کا پہلا ساؤنڈنگ راکیٹ لانچ کیا گیا۔

18 مارچ، 1965: ایلکسی لیونوو نے دنیا کی پہلی خلائی چہل قدمی کی۔

14 جولائی، 1965: میریز 14 اسپیس کرافٹ نے مارس کے قریب پرواز کی اور ایک دوسرے سیارے کی اولین کلوز اپ تصویریں حاصل کیں۔

31 جنوری، 1966: لونا 9 چاند پر اتری اور اس نے چاند کی سطح کا پہلا فوٹوگراف بھیجا۔

24 اپریل، 1967: ولادمر کومروو پہلا خلانورد جس کا خلا میں انتقال ہوا۔ یہ حادثہ سویوز 1 پر لینڈنگ کے دوران پیراشوٹ میں خرابی کی وجہ سے ہوا۔

21 تا 27 دسمبر، 1968: خلانورد فرینک بورمین، بل اینڈرس اور جم لوویل وہ پہلے لوگ تھے جو چاند کے مدار میں داخل ہوئے۔

20 جولائی، 1969: نیل آرم اسٹرانگ چاند پر قدم رکھنے والے پہلے انسان بنے۔

15 اگست، 1969: انڈین اسپیس ریسرچ آرگنائزیشن (ناسا) کا قیام عمل میں آیا۔

6 فروری، 1971: ایلین شیفرڈ چاند پر گولف بال کو ہٹ کرنے والے پہلے انسان تھے۔

19 اپریل، 1971: یو ایس ایس آر کا سلیوٹ 1، پہلا آربٹل اسٹیشن لانچ کیا گیا۔

2 دسمبر، 1971: یو ایس ایس آر کا مارس 3 لینڈر، مارس پر اترنے والا پہلا انسانی آرٹی فیکٹ۔

2 مارچ، 1972: ناسا نے پائنیر۔ 10 نام کا اسپیس پروب لانچ کیا یہ پہلا خلائی پروب تھا جس نے جیوپٹر کی قریبی تصویریں کھینچ کر بھیجیں اور یہ پہلا انسان آرٹی فیکٹ تھا جس نے نظام شمسی کے باہر کا سفر طے کیا۔ (جون 1983)

14 دسمبر، 1972: اپولو 17، چاند پر یادگاری کلمات نشان لگا کر واپس آیا، جس پر تحریر تھا" یہاں انسان نے چاند کی اپنی پہلی کھوج کو دسمبر 1972 میں پورا کیا۔"

14 مئی، 1973: اولین امریکی خلائی اسٹیشن، اسکائی لیب کو خلا میں بھیجا گیا۔ یہ اسٹیشن چار منزلہ تھا اور زمین سے 270 میل کی بلندی پر مدار پر تھا۔

19 اپریل، 1975: اولین ہندوستانی سیٹلائٹ آریہ بھٹ کو لانچ کیا گیا۔

17 جولائی، 1975: سوویت سویوز۔ 19 کی خلا میں امریکی اپولو سے ملاقات ہوئی اور اس نے اس کو پیچھے چھوڑا، اس سے اسٹرونوٹس کو یہ اجازت ملی کہ وہ ایک دوسرے کے جہاز سے آگے بڑھ سکتے ہیں۔

20 جولائی، 1976: وکنگ 1، مارس پر اترا اور اس نے وہاں کی سطح کی تصویریں بھیجیں۔

18 جولائی، 1980: اولین ہندوستانی گھریلو تیار کردہ سیارچہ روہنی-1، سری ہری کوٹا سے دیسی سیٹلائٹ لانچ گاڑی میں بھیجا گیا۔

12 جولائی، 1981: کولمبیا، اولین اسپیس شٹل بنا جو خلا پہنچا، جب سات مہینے بعد اس کو پھر سے خلا میں روانہ کیا گیا تو وہ دنیا کا اولین دوبارہ استعمال ہونے والا اسپیس کرافٹ بنا۔

10 اپریل، 1982: ہندوستانی سیارچہ انسیٹ-1، اے کو لانچ کیا گیا۔

2 اپریل، 1984: ہندوستانی سوویت مشن کے تحت راکیش شرما خلا میں جانے والے پہلے ہندوستانی بنے۔

28 جنوری، 1986: اڑان بھرنے کے 73 سیکنڈ بعد خلائی شٹل چیلنجر دھماکے کے ساتھ ٹکڑے ہوگیا، اس حادثے میں 16 سٹرونوٹ اور ایک ٹیچر ہلاک ہوگئے۔

19 فروری، 1986: میر، پہلا لمبے وقفے والا اسپیس اسٹیشن خلا میں بھیجا گیا۔ یہ اسٹیشن 15 سال تک آربٹ (مدار) میں رہا۔

14 فروری، 1990: وویگر۔ 1، نے پورے نظام شمسی کی پہلی بار تصویر اتاری۔

24 تا 29 اپریل، 1990: شٹل ڈسکوری نے ہبل خلائی ٹیلی اسکوپ کو کام پر لگایا۔

6 اکتوبر، 1990: یولیسیس اسپیس کرافٹ کو سورج کے قطبین (پولس) اور قطبین کے نیچے اور اوپر انٹراسٹیلر اسپیس کے مطالعے کے لیے لانچ کیا گیا۔ جون 1995 میں یہ اسپیس کرافٹ نارتھ پول سے پاس ہوا۔

4 جولائی، 1997: ریڈیلیفیٹ یعنی مرکری پر مارس پاتھ فائنڈر نے اولین روور کو کام پر لگایا۔

29 ستمبر، 1997: آئی آر ایس۔ اڈی سیارچہ کے ساتھ انڈین پی ایس ایل وی کا اولین آپریشنل لانچ عمل میں آیا۔

20 نومبر، 1998: انٹرنیشنل اسپیس اسٹیشن کو لانچ کیا گیا۔ یہ امریکہ کی سربراہی میں 16 ممالک کا مشترکہ پروجیکٹ ہے۔ یہ اسپیس اسٹیشن زمین کی سطح سے 244 میل دور قائم ہے۔

28 اپریل، 2001: ڈینس ٹیٹو، کرایہ دے کر اولین خلائی سیاح بنا، وہ بین الاقوامی خلائی اسٹیشن پر 7 دن تک رکا۔

1 فروری، 2003: اسپیس شٹل کولمبیا لینڈنگ کے لیے کرۂ ہوا میں داخل ہونے کے بعد ایک دھماکے کے ساتھ پھٹ گیا، اور اس میں سوار ساتوں خلا نورد ہلاک ہوگئے۔ جن میں ہندوستانی نژاد خلا نورد کلپنا چاؤلا بھی شامل تھیں۔

15 اکتوبر، 2003: چین نے ٹائکونات کو خلا میں لانچ کیا اور اس کے ساتھ وہ خلا میں انسان کو بھیجنے والا دنیا کا تیسرا ملک بن گیا۔

جنوری، 2004: مارس کی کھوج میں نکلے روورس اپورچیونٹی اور اسپرٹ مارس پر اترے اور اسپرٹ نے اولین اعلیٰ رزولوشن کی تصویریں اتاریں، جس نے مارس پر پانی ہونے کا اشارہ دیا۔

21 جون، 2004: مارس کی کھوج میں نکلے روورس اپورچیونٹی اور اسپرٹ مارس پر اترے اور اسپرٹ نے اولین اعلیٰ رزولوشن کی تصویریں اتاریں، جس نے مارس پر پانی ہونے کا اشارہ دیا۔

21 جون، 2004: اسپیس شپ ون، ایک تجرباتی بین المداری خلائی جہاز نے پہلی مرتبہ نجی سرمایہ لگا کر انسانی خلائی پرواز پوری کی۔

16 جولائی، 2005: ڈھائی سال کے بعد ناسا نے ڈسکوری شٹل کو بھیجنے کے ساتھ خلا میں پھر سے قدم رکھا۔ لیکن شٹل میں شگاف نے پروگرام کو ناکامیاب بنادیا۔

19 جنوری، 2006: نیو ہاریزن اسپیس کرافٹ کو 3 بلین میل سفر کے لیے بھیجا گیا تاکہ پلوٹو کے بارے میں صحیح اعداد و شمار جمع کیے جاسکیں، اس کو اپنے مقام پر 2015 میں پہنچنے کی امید ہے۔

24 اگست، 2006: انٹرنیشنل اسٹرونومکل یونین نے پلوٹو کو سیارے کے درجے سے گھٹا کر ڈوارف پلینیٹ یعنی چھوٹے سیارے کی حیثیت دی۔

22 جون، 2007: سنیتا ولیمس ہندوستانی نژاد امریکی خلا نورد بین الاقوامی خلائی اسٹیشن میں 195 دن بتا کر زمین پر واپس آئیں۔ یہ کسی بھی خاتون خلا نورد کی سب سے لمبی خلائی پرواز تھی۔

ستمبر، 2007: وویگر-1، جس کو لانچ کیے ہوئے تیس سال گزر چکے ہیں، آج خلا میں سب سے دوری پر انسان کا بنایا ہوا آبجیکٹ ہے، جو دسمبر 2004 میں نظام شمسی کی حد کو چھوڑ چکا ہے۔ وویگر-2 کے ساتھ وہ آج بھی ڈاٹا بھیج رہا ہے۔

□□□

پتہ:
Allah Wali Kothi, Doodhpur,
Civil Lihne, Aligarh-202002

فیصل مصطفیٰ

ہندوستانی کتب خانوں میں ڈیجی ٹائزیشن

ہندوستان دور قدیم سے تعلیم وتمدن کا گہوارہ رہا ہے۔ کتب خانوں کا قیام اور انتظام ہندوستان کی قدیم روایت رہی ہے۔ دور قدیم کے کتب خانوں کی حیثیت وہ نہیں تھی جو دور جدید کے کتب خانوں کی ہے۔ جدید طرز کے کتب خانے بیسویں صدی کی پیداوار ہیں لیکن 1950 سے ان میں برق رفتاری سے بدلاؤ آنے شروع ہوئے۔ کمپیوٹر کا زیادہ سے زیادہ استعمال اور انفارمیشن ٹیکنالوجی کے ثمرات سے استفادہ کر کے کتب خانوں نے اپنی اہمیت وافادیت بہت بڑھالی ہے۔ گوکہ ڈیجی ٹائزیشن ایک نیا تجربہ ہے لیکن ہندوستانی کتب خانوں نے اس سمت میں شروعاتی پیش رفت کرلی ہے۔ اگر چہ اس طرح کے تجربات ابھی بہت سست رفتار اور کسی مربوط پالیسی سے عاری ہیں۔ اس کے علاوہ اس کے ثمرات ہندوستان کے شہری علاقوں تک محدود ہیں۔

1960 کے بعد ہندوستانی کتب خانوں نے کمپیوٹر کے ذریعے آف لائن کیٹلاگ (Offline Cataloue) بنانے شروع کردیے تھے جو دستی کیٹلاگوں کا متبادل تھے۔ آن لائن کیٹلاگ Online Catalogue) کے ساتھ ساتھ لائبریری آٹومیشن (Library Automation) کا تصور بھی آیا اور اب ہندوستان کے اکثر جامعاتی کتب خانے لائبریری آٹومیشن سے مستفیض ہو چکے ہیں یا ہو رہے ہیں۔

عددی نگارش (Digitization) انفارمیشن ٹیکنالوجی کی وہ دین ہے جس کے ذریعے ہم کتابوں کے مواد کو عددی صورت میں کمپیوٹر سسٹم میں منتقل کرتے ہیں جو کمپیوٹر اسکرین (Screen) پر نہ صرف پڑھے جاسکتے ہیں بلکہ ان صفحات کی نقل بھی لی جاسکتی ہے۔ اگر چہ مواد کو منتقل کرنے کے طریقے الگ الگ ہیں لیکن ہر صورت میں کتابوں کا مواد کمپیوٹر اسکرین پر منعکس ہوسکتا ہے چاہے وہ الفاظ ہوں یا تصاویر، نقشے ہوں یا گراف وغیرہ۔ عددی نگارش (Digitization) کے سلسلے میں یہ جان لینا ضروری ہے کہ اس کا فائدہ ہم تب حاصل کرسکتے ہیں جب عددی صورتوں کو آن لائن کمپیوٹر پر مہیا کرسکیں۔ جس سے ان کی رسائی عالمگیر ہوجاتی ہے۔ آن لائن ہونے کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ مطلوبہ مواد کو ہم دنیا کے کسی بھی خطے میں بیٹھ کر تلاش کرسکتے ہیں۔ آف لائن (Offline) طرز پر بھی عددی نگارش (Digitization) کا کام کیا جاسکتا ہے لیکن اس سے عددی نگارش (Digitization) کا اصل مقصد فوت ہوجاتا ہے۔ عالمی سطح پر عددی نگارش 1970 سے شروع ہوا لیکن ہندوستان میں یہ کام 1990 سے شروع ہوا۔ پچھلے دس سالوں میں ہندوستان کے کئی تحقیقی وعلمی کتب خانوں نے اس ضمن میں پیش قدمی کی ہے جس کی تفصیل نیچے کی سطروں میں پیش کی جارہی ہے۔

Million Book Project: امریکہ کی ایک تنظیم نیشنل سائنس فاؤنڈیشن (National Science Foundation) انڈین انسٹی ٹیوٹ آف سائنس بنگلور (Indian Institute of Science, Banglore) کے ساتھ مل کر ڈیجی ٹائزیشن کا کام شروع کیا ہے۔ اس ضمن میں بنیادی اہم کتابوں کو خصوصاً ان کتابوں کو جو ناپید ہورہی ہیں یا کمیاب ہوگئی ہیں، ڈیجی ٹائز (Digitize) کرنے کا ایک خاکہ تیار کیا گیا ہے جس کے تحت اس مواد کو عالمی سطح پر انٹرنیٹ پر مہیا کرایا جائے گا۔ اگر یہ کام ہوجاتا ہے تو اس کے ذریعے مواد کی دستیابی ہر جگہ یکساں طور پر ممکن ہوسکے گی اور ان کتابوں کی اہمیت وافادیت مزید بڑھ جائے گی۔

Digital Library of India(DLI): انڈین انسٹی ٹیوٹ آف سائنس (IISC)، کارنجی میلان یونیورسٹی (Carnegie Mellon University (CMU)، انٹرنیشنل انسٹی ٹیوٹ آف انفارمیشن ٹیکنالوجی حیدرآباد اور ہندوستان کے کئی علمی، مذہبی اور سرکاری اداروں نے مل کر مشترکہ طور پر اس پروجیکٹ کی بنیاد ڈالی ہے۔ اس مشترکہ پروجیکٹ میں 20 سے بھی زائد ادارے شامل ہیں۔ اس پروجیکٹ کا مقصد ہندوستان کی نادر ونایاب کتابوں، مخطوطات اور موسیقی سے متعلق چیزوں کو نئی ٹیکنالوجی کے ذریعے محفوظ کرنا ہے۔ ابھی تک تقریباً 289000 کتابوں کو اسکین (Scan) کیا جاچکا ہے جن میں تقریباً 170,000 ہندوستانی زبانوں میں ہیں۔ 84,000 کتابیں جو کہ 25 ملین (Millon) صفحات پر مشتمل ہیں وہ DLI کی ویب سائٹ واقع انڈین انسٹی ٹیوٹ آف سائنس پر مہیا ہیں۔ 149,000 کتابیں جو کہ 43 ملین صفحات پر محیط ہیں DLI کی ویب سائٹ واقع انٹرنیشنل انسٹی ٹیوٹ آف ٹیکنالوجی پر مہیا ہیں۔ تمام شامل اداروں کو یہ کتابیں ایک مشترکہ ویب سائٹ پر مہیا کی گئی ہیں۔ DLI کے اس پروجیکٹ پر آنے والا خرچ مختلف ادارے مل کر پورا کررہے ہیں۔

National Mission for Manuscript Digitization:

ہندوستان ان ممالک میں شامل ہے جن کے پاس قدیم کمیاب مخطوطات کا مجموعہ وافر مقدار میں موجود ہے۔ یہ مختلف زبانوں میں مختلف قسم کی چیزوں مثلاً تاڑ کے پتوں، کپڑوں وغیرہ پر محفوظ ہے۔ ماہرین کا اندازہ ہے کہ یہ

مخطوطات اگلے 50 سے 100 سالوں میں ناپید ہو سکتے ہیں۔ اسی کو مدنظر رکھتے ہوئے ہندوستانی حکومت کی وزارت ثقافت نے 2003 میں ایک پروجیکٹ National Mission for Manuscripts شروع کیا ہے جس کا خصوصی مقصد ڈیجی ٹائزیشن کے ذریعے ہندوستان کے نایاب مخطوطات کی نہ صرف صحیح حفاظت اور رکھ رکھاؤ ہے بلکہ ان نایاب مخطوطات کو عالمی سطح پر متعارف کرانا بھی ہے۔ اس ضمن میں ہندوستانی حکومت کی ایک اور تنظیم نیشنل انفارمیٹکس سنٹر (Naitonal Informatics Centre) نے مخطوطات کے ڈیجی ٹائزیشن کے لیے واضح و جامع اصول مرتب کیے ہیں۔ ان میں ڈیجی ٹائزیشن کے لیے کتابوں کا انتخاب، طریقۂ کار اور دیگر تکنیکی امور کی وضاحت شامل ہے۔ وزارت ثقافت کے تحت قائم مرکزی سکریٹریٹ لائبریری Central Secretrait Library واقع نئی دہلی نے بھی ڈیجی ٹائزیشن کی طرف سرکاری کاغذات مثلاً سالانہ رپورٹوں، کمیشن اور کمیٹیوں کی سفارشات اور گزیٹ آف انڈیا کو عددی صورت میں منتقل کرنے کا اہم فریضہ انجام دے رہی ہے۔ اس ادارے نے تعلیم سے متعلق کئی اہم کمیٹیوں اور کمیشن کی رپورٹوں کو ڈیجی ٹائز کیا ہے جو کیاب ہوتی جارہی تھیں۔

Traditional Knowledge Digital Library (TKDL):

یہ ایک مشترکہ کوشش ہے جس میں نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف سائنس کمیونیکیشن اینڈ انفارمیشن ریسورسس (NISCAIR) کونسل آف سائنٹفک اینڈ انڈسٹریل ریسرچ (CSIR) اور ڈیپارٹمنٹ آف میڈیسن اینڈ ہومیوپیتھی (TSM&H) شامل ہیں۔ TDKL کے ذریعے میڈیسن اور ہومیوپیتھی سے متعلق روایتی معلومات کو نہ صرف محفوظ کرنا ہے بلکہ روایتی علم کو قانونی حیثیت دلانا بھی شامل ہے۔ یہ پروجیکٹ جس میں آیورویدا، سدھا اور یونانی طب جیسے علوم کے متعلق مواد ہے، ان کو دنیا کی پانچ زبانوں — انگریزی جرمن، فرانسیسی، جاپانی اور اسپینی میں فراہم کرنے کا منصوبہ ہے۔ اس خاص پروجیکٹ کے لیے ایک خاص قسم کی کلاسی فیکیشن اسکیم سے مدد لی جارہی ہے جس سے متعلقہ مواد کو بہ آسانی استعمال کیا جاسکے۔ امید ہے کہ اس پروجیکٹ کی تکمیل کے بعد ان روایتی طریقوں کا استعمال صحت کی بہبود کے لیے بہتر طور پر کیا جاسکے گا۔

National Library, Kolkata: ہندوستان کی یہ قومی لائبریری جو کولکاتا میں واقع ہے اور اس کا خاص مقصد ہندوستان سے متعلق ہندوستانی یا غیر ہندستانی تمام کتابوں کو محفوظ کرنا ہے، مطبوعات کے علاوہ یہ کتب خانہ بیش بہا نایاب و کمیاب مخطوطات کا ذخیرہ بھی اپنی چار دیواری میں محفوظ کیے ہوئے ہے۔ ان میں زیادہ تر مخطوطات سنسکرت، فارسی، عربی اور تمل میں ہیں۔ ظاہر ہے ان مخطوطات کو آنے والی نسلوں کے لیے محفوظ کرنے کا سب سے کارگر طریقہ ڈیجی ٹائزیشن ہی ہے۔ اسی کے مدنظر اس لائبریری نے اس سمت میں پہل کی ہے۔ اس کام کے پہلے مرحلے میں اس کتب خانے نے ہندوستان سے متعلق نایاب و نادر کتابوں کو عددی صورت میں منتقل کرنے کا اہم کام شروع کیا ہے۔ چنے ہوئے مواد میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی اہم دستاویزات، ڈائریاں نیز سرکاری کاغذی مخطوطات اور تاڑ کے پتوں والے مخطوطات وغیرہ شامل ہیں۔ تا حال اس کتب خانے نے 6600 ہندوستانی اور انگریزی کتابوں کو عددی صورت میں منتقل کیا ہے۔

Indira Gandhi National Centre for Arts (IGNCA)- Kalasampada: اندرا گاندھی نیشنل سنٹر فار آرٹس ایک قومی سطح کا ادارہ ہے اور اس کا مقصد فن آرٹ سے متعلق دستاویزات، تصاویر اور کتابیں محفوظ کرنا ہے۔ اس ادارے نے بھی ایک مخصوص پروجیکٹ کے تحت جسے کلاسمپدا (Kalasampada) کا نام دیا گیا ہے ڈیجی ٹائزیشن کا کام شروع کیا ہے۔ اس پروجیکٹ کو وزارت کمیونیکیشن اینڈ انفارمیشن ٹیکنالوجی، حکومت ہند سے مالی معاونت مل رہی ہے۔ تا حال اس ادارے نے ہزاروں نادر مخطوطات، نایاب کتابوں، تصاویر اور آرٹ کے دیگر شاہکار نمونوں کو ڈیجی ٹائز کیا ہے۔ امید ہے اس پروجیکٹ کی تکمیل کے بعد محققین کو بہت زیادہ فائدہ حاصل ہو سکے گا۔

Parliament Library: نئی دہلی میں واقع ہندستان کی پارلیمنٹ لائبریری بھی اس جانب متوجہ ہوئی ہے۔ اس لائبریری نے اپنی تمام بحثوں، سوالات، کمیٹیوں کی رپورٹوں، ماضی اور حال کے ممبران پارلیمنٹ کی سوانح حیات نیز ان کی تصاویر اور پتوں کو ڈیجی ٹائز کرنے کا کام شروع کر دیا ہے۔ اس کے علاوہ اس لائبریری نے ان نایاب و نادر مخطوطات کو ڈیجی ٹائز کرنے کے لیے چنا ہے جو عموماً عہد وسطیٰ سے متعلق ہیں اور بیشتر فارسی زبان میں ہیں۔ یہ تمام مواد (Parliament Library Information System) PARLIS پر موجود ہے۔

Indian Institute of Technology: ڈیجی ٹائزیشن سے حاصل ہونے والی سہولتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے ہندوستان میں قائم انڈین انسٹی ٹیوٹ آف ٹیکنالوجی نئی دہلی، ممبئی اور کھڑگ پور نے بھی اپنے کتب خانوں میں اس سمت اچھی پہل کی ہے۔ نئی دہلی میں واقع انڈین انسٹی ٹیوٹ آف ٹیکنالوجی نے 1998 سے نہ صرف یہ کہ انٹرنیٹ کی سہولت فراہم کرنا شروع کیا بلکہ اسی زمانے سے ڈیجی ٹائزیشن کا آغاز بھی کیا۔ اس کام کے لیے اس ادارے کو آل انڈیا کونسل آف ٹیکنکل ایجوکیشن، وزارت انسانی وسائل، حکومت ہند (MHRD) کی طرف سے مالی امداد مل رہی ہے۔ اب تک اس ادارے نے 25000 صفحات سے زیادہ مواد، جریدوں کو اسکین (Scan) کر کے ادارے کی انٹرنیٹ پر مہیا کر دیا ہے۔

ممبئی میں واقع انڈین انسٹی ٹیوٹ آف ٹیکنالوجی نے بھی اس جانب کافی پیش رفت کی ہے۔ اس ادارے نے شروعاتی طور پر Thesis اور Dissertations کے مواد کا Database تیار کیا ہے۔ تا حال 3000 سے زیادہ تھیسس اور ڈیزرٹیشنز کے مواد کو ETD Database پر منتقل کر دیا گیا ہے۔ اس ادارے نے ڈیجی ٹائزیشن کے لیے نیوزی لینڈ میں بنے ہوئے ایک خاص سافٹ ویر کی مدد لی ہے جسے ہم Greenstone Software کے نام سے جانتے ہیں۔

آئی آئی ٹی (IIT) کھڑگ پور کی لائبریری نے بھی ایک 1994 Electronic Library میں بنائی تھی جسے اب ہم Digital Library کے نام سے جانتے ہیں۔ زیادہ تر پرانے جریدوں کے مضامین کو عددی صورت میں ڈھالا گیا ہے۔ اس ادارے کی لائبریری نے اس سمت میں کافی کام کر لیا ہے لیکن مواد تک رسائی صرف کیمپس میں رہ کر حاصل کی جا سکتی ہے۔ ڈیجی ٹائزیشن کے عمل کے لیے اس ادارے نے D-Space سافٹ ویئر سے مدد لی ہے۔

National Institute of Technology: کالی کٹ اور راورکیلا میں واقع نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف ٹیکنالوجی نے ڈیجی ٹائزیشن کا کام شروع کر دیا ہے۔ کالی کٹ میں واقع نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف ٹیکنالوجی نے ڈیجی ٹائزیشن کا کام 1999 میں شروع کیا تھا جو کہ ہندوستان میں بننے والا سب سے بڑا ڈاٹا بیس (Database) ہے۔ اس کے لیے اس ادارے نے ایک سافٹ ویر اور پروجیکٹ بھی تیار کیا ہے جسے ہم نالندہ (Nalanda) کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ اس سافٹ ویر کے ذریعے بنے ہوئے ڈاٹا بیس میں ادارے میں محفوظ مضامین، درسی مواد، ڈیزرٹیشن تھیسس اور سالانہ رپورٹوں کو عددی صورت میں ڈھالا گیا ہے۔ اسی طرز پر راؤرکیلا میں واقع نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف ٹیکنالوجی نے بھی ڈیجی ٹائزیشن کی طرف قدم بڑھایا ہے۔ اس ادارے نے تا حال 343 سے زیادہ کتابوں کے مواد کو عددی قالب میں منتقل کر لیا ہے۔ اس ادارے نے بھی ڈیجی ٹائزیشن کے لیے D-space سافٹ ویئر سے مدد لی ہے۔

خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ: خدا بخش لائبریری ہندوستان کی سب شہرت یافتہ عوامی لائبریری ہے۔ اس کتب خانے میں فارسی، عربی، اردو اور دیگر ہندوستانی زبانوں میں نایاب مخطوطات اور قلمی نسخے موجود ہیں۔ اس کا تفصیلی کیٹلاگ 30 جلدوں میں پہلی بار 1923 میں شائع ہوا تھا اور بعد میں اس کو دوبارہ 1970 میں شائع کیا گیا۔ اس میں محفوظ مخطوطات کو عددی صورت میں منتقل کرنے میں ایک قومی ادارہ NICNET مالی اور انسانی مدد دے رہا ہے۔ اب تک تقریباً 400 ہزار صفحات کو عددی صورت میں منتقل کیا جا چکا ہے۔

اس کے علاوہ فنون لطیفہ سے متعلق چیزوں کو اسکین (Scan) کیا جا رہا ہے۔

ہندوستان کے دیگر کئی اور اداروں نے بھی ڈیجی ٹائزیشن میں دلچسپی دکھائی ہے جو قابل ستائش ہے۔ انڈین اکادمی آف سائنس نے اپنے سائنسی جریدے کو پہلی مرتبہ ڈیجی ٹائز (Digitize) کیا ہے۔ اسی طرح انڈین نیشنل سائنس اکادمی نے بھی ڈپارٹمنٹ آف سائنٹفک اینڈ انڈسٹریل ریسرچ کے ساتھ اشتراک کر کے اپنے زیادہ تر جریدوں کو ڈیجی ٹائز کیا ہے۔ احمد آباد میں واقع فزیکل ریسرچ لیبوریٹری اور میسور یونیورسٹی کے شعبہ لائبریری اینڈ انفارمیشن سائنس نے بھی اس سمت میں کافی ترقی کی ہے۔ بنگلور میں واقع انڈین انسٹی ٹیوٹ آف سائنس نے بھی اہم تحقیقی مقالوں، کتابوں، تکنیکی رپورٹوں، کانفرنس پیپر اور غیر شائع مقالات کو ڈیجی ٹائز کرنا شروع کر دیا ہے۔

ذیل میں چند اور اہم اداروں کے نام لکھے جا رہے ہیں، جنھوں نے ڈیجی ٹائزیشن میں کافی ترقی کر لی ہے:

نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف اوشنوگرافی National Institute of Ocenography، نیشنل کیمیکل لیبارٹری National Chemical Laboratory، انڈین انسٹی ٹیوٹ آف ایسٹروفزیکس Indian Institute of Astrophysics، رمن ریسرچ انسٹی ٹیوٹ Raman Research Institute، انفلب نیٹ سنٹر INFLIB NET CENTRE، انڈین انسٹی ٹیوٹ آف مینجمنٹ Indian Institute of Management، وی وی گری نیشنل لیبر انسٹی ٹیوٹ V.V. Giri National Labour Institue، اندرا گاندھی میموریل لائبریری، حیدرآباد یونیورسٹی، ودیا ندھی پروجیکٹ Vidyanidhi Projects۔

ہندوستان کے کئی ایسے ادارے اور بھی ہیں جن کا ذکر یہاں اختصار کی بنا پر نہیں کیا گیا ہے۔

یہ ضروری ہے کہ ڈیجی ٹائزیشن جیسے کام کے لیے قومی سطح پر یکساں اصول وضوابط اور مستحکم بنیادوں پر ایک پالیسی تشکیل دی جانی چاہیے جس سے نہ صرف اس کام میں تیزی آ سکے گی بلکہ مواد تک رسائی اور انتخاب میں قارئین اور محققین کو مدد بھی ملے گی۔ ضرورت اس بات کی بھی ہے کہ ڈیجی ٹائز مواد کو انٹرنیٹ پر مہیا کیا جائے جس سے نہ صرف اس کی شہرت عالمی ہو سکے گی بلکہ مواد کا استعمال کہیں زیادہ ہو سکے گا۔

□□□

پتہ:
College of Teacher Education
Near Hurriat Office,
Karsoraj Bagh, Srinagar-190008

شیویہ دویدی

غذائی بحران

گذشتہ چند مہینوں سے پوری دنیا بھوک اور اشیائے خوردنی کی کمی کے مسئلے سے دوچار ہے۔ صنعتی اور معاشی ترقی کے اس دور میں شوڈان، صومالیا، روانڈا اور ایتھوپیا میں لاکھوں لوگ بھوک سے مرچکے ہیں اور بھوکے غریب لوگوں میں اس قدر غصہ ہے کہ وہاں اناج کی تقسیم کے لیے بین الاقوامی فوجیں تعینات کرنی پڑی ہیں۔ انسان کی تین اہم ضرورتوں (روٹی، کپڑا اور مکان) میں سے ایک اس دفعہ بحران کی لپیٹ میں ہے۔ غذا حاصل کرنا انسان کا پیدائشی حق ہے۔ دوسری عالمی جنگ کے بعد سے متحدہ ممالک کی تنظیم (UNO) نے اس مسئلے کو اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ بین الاقوامی انسانی حقوق چارٹر کے مطابق ہر ملک کی حکومت کا یہ فرض ہے کہ وہ اپنے باشندوں کے لیے معقول مقدار میں صحت بخش غذا کا انتظام کرے۔ مگر بقول بان کی مون، ڈائرکٹر جنرل، یو.این.او آج دنیا میں تقریباً 85 کروڑ 40 لاکھ لوگ بھکمری کا شکار ہیں۔ یہ تعداد کئی ترقی یافتہ ممالک کی کل آبادی سے بھی زیادہ ہے۔ بھکمری کے شکار ان لوگوں میں 60 فی صد عورتیں ہیں جو سماج میں اپنے دوئم درجے کے باعث دیگر مشکلات کی طرح بھوک کی بھی بڑی تعداد میں شکار ہیں۔ 18 برس سے کم عمر کے افراد میں تقریباً 40 فی صد ناقص تغذیہ (Mal Nourishment) سے ہونے والی بیماریوں میں مبتلا ہیں۔ دنیا میں ہر پانچ سیکنڈ میں ایک نو وارد دم توڑ دیتا ہے۔ ترقی پذیر ممالک میں ہر برس 5 سال سے کم عمر کے 10 کروڑ 90 لاکھ بچے بھوک، غریبی اور ان سے ہونے والی بیماریوں کی نذر ہو جاتے ہیں۔ ان ملکوں میں ہر 4 میں سے 1 بچے کا وزن اوسط سے کم ہوتا ہے۔

ہندوستان کی حالت پر اگر غور کریں تو عالمی بھکمری کی فہرست (Global Hunger Index) میں شامل 118 ممالک میں ہم 94 نمبر پر ہیں۔ چین اور برازیل جیسے دوسرے ترقی پذیر ملکوں سے پیچھے ہونے کے ساتھ ساتھ جنوبی ایشیا میں بھی ہندوستان کی حالت صرف بنگلہ دیش سے بہتر ہے۔ پاکستان بھی اس فہرست میں ہم سے اوپر 88 نمبر پر ہے۔ عالمی غذائی پروگرام کے مطابق دنیا میں 6 میں سے 1 اور ہندوستان میں ہر 3 میں سے 1 شخص کو بھر پیٹ روٹی میسر نہیں۔ اس افراط زر کی شرح پچھلے 7 برسوں میں پہلی دفعہ 7.33 فی صد تک پہنچ گئی ہے۔ ESOCHAM کے مطابق 2003 سے 2008 کے بیچ دالیں 34 فیصد، گیہوں 24 فیصد، مسالے 22 فیصد اور دودھ 18 فیصد مہنگا ہوا ہے۔ اب سوال یہ اٹھتا ہے کہ کیا موجودہ غذائی بحران مصیبتِ ناگہانی ہے؟ کیا گذشتہ کئی برسوں سے ماہرین ماحولیات و معاشیات اس کے متعلق واضح اشارے نہیں کر رہے تھے؟ پھر اس بحران کی وجوہ کیا ہیں جس نے اتنے بڑے پیمانے پر پوری دنیا کو اپنی گرفت میں لے رکھا ہے؟

سب سے پہلے جس بات پر نظر جاتی ہے وہ ہے بڑھتی آبادی۔ ترقی پذیر ممالک شرح آبادی پر قابو پانے میں ناکام ثابت ہوئے ہیں۔ بڑھتی آبادی کے تناسب سے پیداوار میں اضافہ نہیں ہو رہا ہے۔ 1996 سے جہاں پیداوار میں اضافے کی در جامد ہے وہیں آبادی میں ہر برس 7 کروڑ 20 لاکھ کا اضافہ ہو رہا ہے۔ ہندوستان کا ذکر کریں تو پچھلے 20 برسوں میں آبادی 1.9 فیصد کی شرح سے بڑھی ہے جبکہ اجناس کی پیداوار میں اضافے کی در 1.7 فیصد ہے۔ بظاہر 0.2 فیصد کا یہ فرق 100 کروڑ سے زیادہ کی آبادی والے ملک میں بہت بڑی تعداد میں عوام کو بھوکوں مرنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ یو.این.او. کے قائم کردہ اندازوں کے مطابق 2050 تک دنیا کی آبادی موجودہ 6.6 بلین سے بڑھ کر 9.2 بلین ہو جائے گی۔ اگر چہ ماہرین کا خیال ہے کہ 2050 تک دنیا کی آبادی 50 فیصد تک بڑھنے کے بعد جمود کی کیفیت اختیار کرے گی مگر غذائی اور کاشت کاری تنظیم (FAO) کے مطابق اس بڑھتی ہوئی آبادی کے لیے 2050 تک اناج کی پیداوار کو دوگنا کرنا ہوگا جو کہ موجودہ حالات میں بہت مشکل نظر آتا ہے۔ بہر حال چونکہ آبادی میں اضافہ یکا یک نہیں ہوا اور یہ اضافہ قرین قیاس تھا اس لیے بڑھتی آبادی موجودہ بحران کا واحد سبب نہیں ہو سکتی۔

موجودہ صورت حال پر غور کریں تو ہم پائیں گے کہ دنیا بھر میں عام طور پر اور خاص طور پر ترقی پذیر ملکوں میں زراعت کی حالت بگڑتی جا رہی ہے۔ ہندوستان اور بنگلہ دیش جیسے ملکوں میں کاشت کاری گھاٹے کا سودا بنتی جا رہی ہے۔ ہندوستان میں محض 30 سے 40 فیصد کسان ہی بیچنے لائق اناج پیدا کر پاتا ہے۔ حکومت کی طے کردہ قیمتوں (Minimum Support Price) اور عوامی تقسیم (Public Distribution System) کے باوجود نہ تو کاشت کار کو اس کی فصل کی صحیح قیمت مل پاتی ہے اور نہ ہی عوام کو ضرورت بھر سستا اناج مل پاتا ہے۔ کسان سرکاری محکموں اور دفتروں تک پہنچ نہ ہو پانے کے باعث اپنی فصل بچولیوں کے ہاتھوں بیچنے کو مجبور ہو جاتے ہیں۔ اس سے ایک طرف تو کاشت کار کو واجب قیمت نہیں ملتی، دوسری طرف حکومت کے پاس معقول مقدار میں اناج کے بفر اسٹاک نہیں بن پاتے اور تیسری طرف یہ بچولیے کسانوں سے خریدے گئے اناج کو بازار میں بڑھی ہوئی قیمتوں پر بیچتے ہیں۔ منافع کی خواہش میں ذخیرہ اندوزی بھی بڑھ جاتی ہے جس سے قیمتوں میں مزید اضافہ ہو جاتا ہے۔ ترقی پذیر ممالک میں کاشت کار نہ تو نئی تکنیک سے واقف ہیں نہ ان کے پاس اتنی پونجی ہے کہ وہ ان تکنیکوں کا استعمال کر سکیں۔ ہندوستان میں 1960 کی دہائی میں شروع ہوئے سبز انقلاب کی پہنچ آج بھی محض 30 فیصد کھیتوں تک ہو سکی ہے۔ حالت یہ ہے کہ کسانوں کے لیے 60,000 کروڑ روپے کی قرض معافی کے بعد سے اب تک مہاراشٹر کے ودربھ علاقے میں 125 کسان خودکشی کر چکے ہیں۔ صنعتی ترقی کے اس دور میں دوسرے اور تیسرے سیکٹر کی

بڑھتی اہمیت نے کھیتی کو پس پشت ڈال دیا ہے۔

صنعتی ترقی کی دوڑ میں جن زمینوں کو کارخانوں اور خصوصی معاشی زون کے تحت لیا جارہا ہے اس سے بھی کھیتی کے لیے موجود زمین میں کمی آرہی ہے۔ تازہ مثال ہریانہ کا ہے جہاں ریلائنس گروپ کو حکومت 25,000 ایکڑ زمین مہیا کرا رہی ہے۔ غور طلب ہے کہ ملک بھر میں پنجاب، ہریانہ اور مغربی یوپی میں اجناس کی پیداوار سب سے زیادہ ہے۔ ظاہر ہے کہ کثیر پیداوار والے ایسے حصے کی 25,000 ایکڑ زمین اناج کی پیداوار کے لحاظ سے ملک کے لیے بہت قیمتی ہے، خاص طور سے موجودہ بحران کے وقت میں ترقی کے اس سفر میں کھیتی کو نقصان پہنچانے والی ایک اور وجہ ہمارے سامنے آتی ہے، حیاتی ایندھن (Bio-Fuel) کی شکل میں۔ دنیا کی انرجی سے متعلق ضروریات میں روز بروز اضافہ ہورہا ہے۔ بڑھتی قیمتوں کے باعث تمام ممالک پیٹرولیم پر اپنا انحصار کم کرنے کی کاوش میں لگے ہیں اور اس کا ایک راستہ ہے حیاتی ایندھن جو گنا، جوار وغیرہ اور مکا جیسی فصلوں سے حاصل ہوسکتا ہے۔ ظاہر ہے پیٹرول کی سیاست سے ابھرنے کے لیے بہت سے ملک اس جانب رخ کررہے ہیں اور ان فصلوں کو بڑھاوا دے رہے ہیں۔ ان فصلوں کو اگانے والے کاشت کاروں کو منافع بھی زیادہ ہورہا ہے مگر اس سے بھی اناج کی پیداوار پر اثر پڑ رہا ہے کیوں کہ زمین کا ایک بڑا حصہ ان فصلوں کی نذر ہوجاتا ہے اور کسان بھی منافع والی فصلوں کو اگانے میں ہی دلچسپی لیتا ہے۔ یعنی ایک طرف تو ہم پیٹرول کی قیمتوں کو بے اثر کرنے کے لیے حیاتی ایندھن تیار کررہے ہیں اور دوسری طرف اس سے زیادہ اہم اجناس کی پیداوار میں کمی کر کے اشیائے خوردنی کی قیمتوں میں اضافہ کررہے ہیں۔

عالمی سطح پر ہونے والی معاشی ترقی پر غور کریں تو ہم دیکھیں گے کہ ایک طرف غریب طبقہ مزید غربت کا شکار ہورہا ہے دوسری جانب ارب پتیوں کی تعداد میں اضافہ ہورہا ہے۔ اس کے علاوہ چین اور ہندوستان جیسے ترقی پذیر ملکوں میں تیزی سے ایک متوسط طبقہ پیدا ہورہا ہے جس کے پاس معقول آمدنی ہے۔ ترقی پذیر ملکوں میں لوگوں کی آمدنی میں اضافے سے بازار میں مختلف چیزوں کی مانگ بھی بڑھی ہے جس کے باعث قیمتوں میں اضافہ ہونا ناگزیر ہے۔ یہ صحیح ہے کہ آمدنی کے مقابلے میں خوراک میں اسی در سے اضافہ نہیں ہوتا مگر یہ بھی سچ ہے کہ ہندوستان اور چین میں تیزی سے بڑھتے اس متوسط طبقے نے ڈبہ بند کھانے اور گوشت کی کھپت میں مزید اضافہ کیا ہے۔ ظاہر ہے جہاں غریب طبقہ دو وقت کی روٹی کے لیے گیہوں نہیں خرید پاتا وہیں اس نئے طبقے کو نظر میں رکھتے ہوئے بازار میں طرح طرح کے ڈبہ بند فاسٹ فوڈ روزانہ لانچ کیے جارہے ہیں۔ اس سے بھی اجناس اور دیگر اشیائے خوردنی پر دباؤ بڑھتا ہے۔ 1980 کے مقابلے میں آج دنیا میں گوشت کی کھپت تین گنا زیادہ ہے۔ ظاہر ہے اس سے زمین کا ایک حصہ جانوروں کی خوراک اور چارے کے لیے صرف ہوتا ہے۔ ایک اندازے کے مطابق دنیا میں پیدا ہونے والے اناج کا ایک تہائی حصہ جانوروں کی خوراک پر خرچ ہوتا ہے۔

ماحولیاتی نظام میں تبدیلی بھی پیداوار پر اثر انداز ہورہی ہے۔ بارش، باڑھ اور سوکھا جیسی فطری آفتوں میں اضافہ ہوتا جارہا ہے۔ ماحولیات کی بہتری کے لیے بروقت ضروری قدم اٹھانے میں کوتاہی برتی گئی کیوں کہ اسے ترقی کی راہ میں حائل سمجھا گیا، خاص طور سے ترقی یافتہ ممالک نے اس معاملے میں اپنی ذمے داری قبول نہ کی اور آج حالت یہ ہے کہ دنیا میں گیہوں کی سب سے زیادہ برآمد (export) کرنے والے ملکوں میں سے ایک آسٹریلیا مسلسل 7 برس سے سوکھے کی مار کو جھیل رہا ہے جس کا نقصان پوری دنیا اٹھا رہی ہے۔

آخر میں اس بحران کی ایک اہم وجہ جو تصویر کو مزید واضح کرتی ہے، وہ ہے عالمی سیاست اور نامساوی معاشی حالات۔ غور طلب ہے کہ اس وقت دنیا میں اتنا اناج موجود ہے کہ ہر شخص کو 2500 کیلوری روزانہ حاصل ہوسکتی ہے۔ UNO کے مطابق ہر شخص کے لیے روزانہ 3000 کیلوری آئڈیل اور 2200 کیلوری ضروری ہے۔ ظاہر ہے موجودہ بحران میں بھی دنیا کے ہر شخص کی ضرورت کو پورا کرنے کی بھرپور پیداوار ہورہی ہے مگر اصل مسئلہ ہے اس کی نامساوی تقسیم کا۔ جو ممالک معاشی طور پر خوشحال ہیں وہی اپنی ضرورت کے مطابق اجناس اور دیگر اشیائے خوردنی کی درآمد کرپاتے ہیں۔ مثلاً بلجیم، نیدرلینڈ، لگزمبرگ اور برطانیہ اپنی ضرورت کا آدھا اناج ہی پیدا کرپاتے ہیں مگر چونکہ یہ معاشی طور سے مضبوط ہیں اس لیے آسانی سے اناج کی درآمد کرلیتے ہیں۔ وہیں اناج کی اچھی پیداوار والے ہندوستان میں ایک شخص روزانہ 1970 کیلوری اوسطاً ہی حاصل کرپاتا ہے۔ یہاں 90 فیصد لوگوں کی خوراک میں کسی نہ کسی مقوی غذائی عنصر کی کمی پائی جاتی ہے۔ دنیا میں صرف 33 ملک ایسے ہیں جہاں کے لوگ 3000 کیلوری روزانہ لیتے ہیں۔ FAO کے مطابق عالمی منڈی میں 46 ملکوں نے گیہوں کی خرید کی مگر ان میں سے واقعی ضرورت مند صرف 7 ملک تھے۔ ظاہر ہے کہ غریب اور ضرورت مند ممالک قوت خرید نہ ہونے کے باعث اپنے باشندوں کو معقول غذا بھی مہیا کرانے میں ناکام ہیں۔ اناج کو بھی معاشی سیاست کا حصہ بنا دیا گیا ہے اور گیہوں کو تو ''سیاسی جنس'' ہی کہا جانے لگا ہے۔ معاشی سیاست کے اس کھیل میں امریکہ جیسے ملکوں کا اہم حصہ ہے جو ہر برس اپنے کسانوں کو ہزاروں ایکڑ زمین خالی چھوڑنے کے عوض سبسڈی دیتے ہیں تاکہ رسد (Supply) بڑھنے سے عالمی بازار میں قیمتیں کم نہ ہوجائیں۔ یہی نہیں بلکہ ہونے والی پیداوار میں سے لاکھوں ٹن اناج ہر برس سمندر میں پھینک دیا جاتا ہے تاکہ قیمتیں گھٹنے نہ پائیں، جب کہ امریکہ کے ٹھیک نیچے واقع ایک چھوٹے سے ملک ہیٹی (Haiti) کے لوگ بھوک کی شدت سے نمک اور مٹی چاٹنے کو مجبور ہیں۔ انسانیت کو ہلا دینے والی اس دلدوز صورت حال کے بعد بھی کیا عالمی برادری کا اپنے فرائض سے غافل رہنا قابل معافی ہے؟ □□□

پتہ:
Urdu Deptt. University of Allahabadb,
Allahabad (U.P.)

علی معصوم رضا

فورینسک سائنس میں روزگار کے مواقع

جرائم کی گتھی سلجھانے میں قانون کی مدد کے لیے ہی فورینسک سائنس کا جنم ہوا۔ بدلتے معاشرتی ماحول میں جس طرح روز بروز جرائم میں اضافہ ہو رہا ہے، اس سے فورینسک سائنس کی اہمیت کافی بڑھتی جا رہی ہے۔ یعنی اس دور میں فورینسک تجربہ کاروں کی سخت ضرورت ہے۔

کیا ہے فورینسک سائنس؟ جرائم کی چھان بین میں سائنسی اصولوں کے استعمال کو ہی فورینسک سائنس کہا جاتا ہے۔ یہ ایک تجربہ گاہ پر مبنی پیشہ ہے جس میں موقعۂ واردات سے برآمد تمام ثبوتوں کا تجزیہ کرنے کے بعد انھیں ملزم سے ملا کر عدالت میں ثابت کیا جاتا ہے کہ مذکورہ جرم فلاں شخص نے ہی انجام دیا ہے۔ ان ثبوتوں میں خون، تھوک، بال، پیشاب اور انگلیوں کے نشان سے لے کر جوتے، چپل، ٹائر کے نشان اور زہر و بارود کے اجزا تک شامل ہو سکتے ہیں۔ فورینسک سائنس کسی ایک سائنس کی شاخ نہیں ہے بلکہ یہ کئی شاخوں کی آمیزش ہے۔ خاص طور پر اسے میڈیکل (علاج)، لیبارٹری (تجربہ گاہ) اور فیلڈ سائنس (موقعۂ واردات کا سائنس) جیسے تین حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ اس میں جہاں بیالوجی، علم نفسیات، علم عمرانیات، فورینسک میڈیسن اور دانتوں کا علاج جیسے میڈیکل کے مضامین کو شامل کیا گیا ہے وہیں علم کیمیا، علم حیاتیات، ٹاکسیکولوجی (زہر سے متعلق)، دھماکہ خیز مادہ، فنگر پرنٹس، دستاویز اور نشان سے متعلق علم بھی سکھائے جاتے ہیں۔

کام: فورینسک سائنسداں پولس کے ساتھ مل کر کام کرتے ہیں تاکہ عدالت میں ثبوتوں کی بنیاد پر مجرم کا جرم ثابت ہو سکے۔ آج کل فورینسک سائنس کا دائرہ کافی وسیع ہو گیا ہے۔ برین میپنگ، نارکوٹیسٹ اور پالی گراف جیسی جدید ٹیکنالوجی ایجاد ہونے کے بعد اب یہ فورینسک تجربہ گاہ میں مجرم کی دماغی اور جسمانی حالت سے سچائی اگلوانے کا کام بھی کرتے ہیں۔ انھیں کسی بھی دستاویز، لکھاوٹ یا انگلیوں کے نشان پڑھنے میں مہارت ہوتی ہے۔ علاوہ ازیں کسی کے دستخط کی مدت جاننے، کسی سامان پر کیے گئے دعوے کی سچائی جاننے اور صنعتوں کے ماحولیاتی ڈائریکشن جیسے سول معاملوں میں بھی ان کا استعمال کیا جاتا ہے۔

ذاتی خصوصیات: اس میدان کے لیے تحقیقی مزاج اور مضبوط قوتِ ارادہ کا ہونا بہت ضروری ہے۔ ایک فورینسک ماہر میں تیز نظر، جانچنے پرکھنے کی طاقت اور تیز دماغ جیسی خصوصیات کا ہونا بھی ضروری ہے۔ علاوہ ازیں ٹیم کے ساتھ مل کر کسی گتھی کو سلجھانے کے لیے منطقی، تجزیاتی اور اصولی طریقوں کو بروئے کار لانے کی صلاحیت ہونی چاہیے نیز اس کے اندر محنت، لگن اور مشکل حالات سے لڑنے کی بھی طاقت ہونی چاہیے۔

کورسیز: فورینسک سائنس کو کسی ایک کورس میں قید نہیں کیا جا سکتا۔ الگ الگ مضامین میں مہارت حاصل کرنے کے لیے اس کا اسپیشلسٹ ہونا ضروری ہے۔ اس لیے اس کا کوئی متعین کورس نہیں ہے۔ ہاں! ایم. ڈی. ان فورینسک سائنس ایک ایسا کورس ہے جو فورینسک سائنس میں مہارت حاصل کرا دیتا ہے، لیکن اس کا دائرہ بھی محدود ہے۔ اسے ایم. بی. بی. ایس. کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد کیا جا سکتا ہے۔ ہندوستان کی تمام یونیورسٹیوں یا میڈیکل کالج جو ایم. بی. بی. ایس. کی ڈگری دیتے ہیں، وہاں ایم. ڈی. ان فورینسک سائنس کی پڑھائی بھی ہوتی ہے۔ علاوہ ازیں فورینسک سائنس میں ماسٹرس کورس بھی موجود ہیں، جن کے لیے فزکس، کیمسٹری، زولوجی، بائنی، بایو کیمسٹری، مائیکرو بایولوجی، بی فارما، ڈی. ڈی. ایس. اور اپلائیڈ سائنسیز میں سے کسی بھی مضمون میں گریجویشن پہلی پوزیشن کے ساتھ پاس ہونا ضروری ہے۔ اسے اس میدان میں اعلیٰ تعلیم کے لیے ایم. فل. اور پی. ایچ. ڈی. کے لیے تحقیق کے کاموں میں بھی لگایا جا سکتا ہے۔

روزگار کے امکانات: فورینسک ماہرین کو پولیس، تحقیقی سروس، قانونی ایجنسیوں اور قانونی کاموں جیسی سرکاری نوکریوں کے ساتھ ساتھ فورینسک کے ذاتی میدانوں میں بھی روزگار مل سکتا ہے۔ فورینسک ماہرین کو پولس فورینزیکی کرائم برانچ میں چھان بین افسران کے طور پر اور انٹیلی جنس بیورو (آئی بی) اور مرکزی تحقیقی بیورو (سی بی آئی) میں سرکاری نوکری ملنے کے زیادہ امکانات ہوتے ہیں۔ تقریباً تمام سرکاری اسپتالوں میں بھی فورینسک ماہرین کی ضرورت پڑتی ہے، جو وہاں ہونے والے مشکوک معاملوں اور اموات کی تفتیش کرتے ہیں۔ علاوہ ازیں بنگلور اور احمد آباد جیسی فورینسک سائنس لیبارٹریز میں بھی روزگار کے اچھے امکانات ہیں۔ سرکاری ملازمت کے علاوہ آج کل خوب پھل پھول رہی پرائیویٹ ڈیٹیکٹیو ایجنسی میں بھی کریئر کے روشن امکانات ہیں۔

ادارے:

- انسٹی ٹیوٹ آف کرمنولوجی اینڈ فورینسک سائنس، جھنڈے والان ایکسٹینشن، نئی دہلی
- لکھنؤ یونیورسٹی، بادشاہ نگر لکھنؤ
- فورینسک سائنس ڈیپارٹمنٹ، فورینسک ہاؤس، ماملا پورم، چنئی

- دہلی یونیورسٹی، دہلی
- ڈاکٹر بھیم راؤ امبیڈکر یونیورسٹی، پالیوال پارک، آگرہ (اتر پردیش)
- انا یونیورسٹی، چنئی
- پنجاب یونیورسٹی، چنڈی گڑھ
- فورینسک سائنس لیباریٹری (ایف ایس ایل) احمد آباد

تحقیقی ادارے

- سینٹرل فورینسک سائنس لیباریٹری، راما ناتھ پور، حیدر آباد
- سینٹرل فورینسک سائنس لیباریٹری، گورا چاند روڈ، کولکاتا
- سینٹرل فورینسک سائنس لیباریٹری، کولکاتا
- سینٹرل فورینسک سائنس لیباریٹری، بنگلور

□□□

پتہ:
C/o. Dr. Md. Zahid,
1114, Ganjmeer Khan, Behind Delite Cinema,
Darya Ganj, New Delhi - 110002

انیس کے سلام

مرتب: علی جواد زیدی

غزل کے تشکیلی مزاج میں عشق اور سلام کو اعتقاد کے طور پر انفرادیت حاصل ہے۔ یہ وہ اعتقاد ہے جس میں اخلاقی، منقبتی، رثائی، مدحیہ اور بھکتی جیسے موضوعات شامل ہوتے ہیں۔ ابتدائی دور کے سلام پر اعتقاد کی ہی فضا چھائی ہوئی تھی لیکن یہی صنف جب انیس تک پہنچی تو اس میں ایک جدید ادبی لب ولہجہ قائم ہوا۔ انیس نے سلام میں رثائی موضوعات کے علاوہ ذاتی مسائل، زمانے کی ناقدری، معاصرانہ چشمک اور بلند خیالی جیسے مضامین کو جگہ دی۔ ''انیس کے سلام'' مرتبہ علی جواد زیدی میں انیس کے تمام مطبوعہ اور غیر مطبوعہ سلام شامل ہیں جس میں سلاموں کی تعداد 102 ہے۔

صفحات: 307، قیمت -/60 روپے

نئی شعری روایت

مصنف: شمیم حنفی

دنیائے ادب میں برپا ہونے والی نت نئی تبدیلیوں نیز رجحانوں اور تحریکات سے شمیم حنفی کی واقفیت کا اندازہ ان کی پیش نظر تصنیف ''نئی شعری روایت'' سے لگایا جاسکتا ہے جو تین مستقل ابواب بعنوان بیسویں صدی کی اردو شاعری میں جدیدیت کی روایت اور اس کے مضمرات، نئی جمالیات اور تخلیقی عمل اور اظہار و ابلاغ کے مسائل پر مبنی ہے۔ اپنی انفرادیت کے لحاظ سے اس کتاب کا معروضی مطالعہ طلبہ و اساتذہ میں بحث کی نئی راہیں پیدا کرتی ہیں۔

صفحات: 240، قیمت -/127 روپے

واجد علی شاہ کی ادبی اور ثقافتی خدمات

مصنف: کوکب قدر سجاد علی میرزا

نواب واجد علی شاہ کی شخصیت کا اصل معیار طے کرنے کے لیے سنی سنائی باتوں کے بجائے تاریخی شواہد کا مطالعہ ناگزیر ہے۔ مصنف نے اس کتاب میں واجد علی شاہ کی ذاتی، سیاسی، تعلیمی و ثقافتی زندگی کو تاریخ اور حقائق کے پس منظر میں دیکھنے کی کوشش کی ہے جس میں ان کی ولادت، خاندان، تعلیم، ازدواجی زندگی، اولاد، ولی عہدی، شاہی معزولی، نظربندی، جلاوطنی سے وفات تک کی روزمرہ کی سرگرمیوں اور ان کی شعری ونثری تمام تصانیف کا تحقیقی مطالعہ اس کتاب میں پیش کیا ہے۔ یہ کتاب اس لیے بھی اہم ہے کہ اس کے مصنف کوکب قدر سجاد علی میرزا کا تعلق نواب واجد علی شاہ کے خانوادے سے ہے۔

صفحات: 688، قیمت -/97 روپے

محمد اعجاز

کیا آپ کریڈٹ کارڈ کمپنیوں سے پریشان ہیں؟

کریڈٹ کارڈ رکھنا آج شہری طرز زندگی کا ایک اہم حصہ بن گیا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کی وجہ سے صارفین کو کئی سہولتیں حاصل ہوئی ہیں لیکن ایک تلخ حقیقت یہ بھی ہے کہ کریڈٹ کارڈ کبھی کبھی گاہکوں کو خواہ مخواہ کی پریشانی میں بھی ڈال دیتے ہیں۔ اس کے لیے بہت حد تک کریڈٹ کارڈ جاری کرنے والے بینک اور ان کے افسران ہی ذمے دار ہوتے ہیں۔ کریڈٹ کارڈ کا استعمال کرنے والے کسی بھی شخص سے بات کیجیے وہ آپ کو بتا دے گا کہ کریڈٹ کارڈ کمپنیوں نے اس کے ساتھ کیسا سلوک کیا ہے۔ مثال کے طور پر کریڈٹ کارڈ کمپنیوں کے ذریعے مفت کارڈ دینے کے منصوبے کو لیجیے۔ ایک غیر سرکاری تنظیم نے تحقیق کے بعد یہ خلاصہ پیش کیا کہ مفت کریڈٹ کارڈ دینے کے باوجود گاہکوں سے تین سالوں میں تین ہزار روپے تک وصول کر لیے جاتے ہیں۔

ایسا نہیں ہے کہ سرکار نے کریڈٹ کارڈ بینکوں کو یہ کھلی چھوٹ دے رکھی ہے کہ وہ گاہکوں سے جو سلوک چاہیں کریں۔ حال ہی میں عدالت عظمیٰ نے ایک معاملے کی سنوائی کرتے ہوئے کریڈٹ کارڈ کمپنیوں کو پھٹکار تو لگائی ہی ساتھ ہی بینکوں کو یہ سمجھاؤ بھی دیا ہے کہ کریڈٹ کارڈ کاروبار کس طرح سے کیا جانا چاہیے۔ اس سے پہلے ریزرو بینک نے بھی بینکوں کو کریڈٹ کارڈ چلانے سے متعلق ہدایات جاری کی تھیں جن میں انھیں صاف ستھرے ڈھنگ سے کاروبار کرنے کو کہا گیا ہے۔ ریزرو بینک نے کریڈٹ کارڈ گاہکوں کو ایسے اختیارات دیے ہیں جن کا استعمال کر کے بینکوں اور ان کے ایجنٹوں کی بے قاعدگیوں کے خلاف کارروائی کی جا سکتی ہے۔ لیکن ریزرو بینک کے ان احکام کے بارے میں ابھی بہت کم لوگوں کو معلوم ہے۔

ریزرو بینک نے سبھی بینکوں کو یہ ہدایت دی ہے کہ کریڈٹ کارڈ کاروبار کے تعلق سے ان کے پاس صاف ستھرے اور شفاف اصول ہونے چاہئیں۔ ریزرو بینک کی یہ ہدایت اس لیے آئی ہے کہ اکثر بینکوں کے اصول صاف ستھرے نہیں ہیں۔ نجی بینکوں کا ریکارڈ سرکاری بینکوں سے زیادہ خراب ہے۔ سب سے زیادہ شکایتیں آئی سی آئی سی آئی بینک، اے بی این ایمرو، ایچ ڈی ایف سی جیسے بینکوں کے خلاف آئی ہیں۔

شرح سود: ریزرو بینک نے کریڈٹ کارڈ پر لگائے جانے والی شرح سود کے بارے میں تو کچھ نہیں کہا ہے لیکن یہ ضرور واضح کیا ہے کہ شرح سود میں تبدیلی یا مالی جرمانے کے بارے میں گاہکوں کو وقت پر اطلاع مل جائے۔ ریزرو بینک نے یہ بھی کہا ہے کہ مالی جرمانہ لگانے کے بعد گاہکوں کو ادائیگی کے لیے کم از کم پندرہ دن کا وقت دیا جانا چاہیے۔ کئی بار یہ دیکھنے میں آتا ہے کہ ادائیگی کی تاریخ کے دو تین روز پہلے ہی کریڈٹ کارڈ بل بھیجا جاتا ہے اور ادائیگی نہ ہونے پر جرمانہ لگا دیا جاتا ہے۔ اس لیے بینک نے اگر آپ کو وقت پر بل نہیں بھجوایا ہے تو آپ اس کی شکایت ریزرو بینک آف انڈیا کے پاس بھیج سکتے ہیں۔

ایسا بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ بینک آپ کو اطلاع دیے بغیر ہی کارڈ کے ساتھ آپ کو ایک زائد کارڈ یا بیمہ یا کوئی دوسری خدمت دے دیتے ہیں۔ بعد میں اس کی فیس بھی آپ سے وصول کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اگر اب آپ کے ساتھ کبھی ایسا ہو تو فوراً اس کی شکایت ریزرو بینک یا اپنے علاقے کے بینک Ombudsman (سرکاری عہدہ داروں کے خلاف شکایات کی تحقیق پر مامور افسر) سے کر سکتے ہیں۔ دہلی میں مامور ایک Ombudsman نے ایک کریڈٹ کارڈ گاہک کو 30,000 روپے کا ہرجانہ دینے کا حکم دیا تھا۔ وہ گاہک ایک نجی بینک کا کارڈ استعمال کرتا تھا۔ مکمل ادائیگی وقت پر کرنے کے باوجود کمپنی نے اس پر جرمانہ لگا دیا تھا۔

ڈی.ایس.اے. پر پریشان کرے تو: گاہکوں کو معلوم ہونا چاہیے کہ ملک کی کئی عدالتوں نے کریڈٹ کارڈ دینے والے بینکوں اور ان کے ڈائرکٹ سیلنگ ایجنٹ (DSA) کے خلاف معاملوں کی سنوائی کی ہے۔ خاص طور پر ڈی.ایس.اے. کے پالتو غنڈوں کی طرف سے گاہکوں کو دھمکانے کے کئی معاملے سامنے آئے ہیں۔ ابھی تک یہ بینک یہ کہہ کر بچ نکلتے تھے کہ ڈی.ایس.اے. کی طرف سے ہونے والی غلطیوں کے لیے بینکوں کو ذمے دار نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔ لیکن ریزرو بینک نے اب صاف صاف کہہ دیا ہے کہ ڈی.ایس.اے. کی سطح پر اگر کوئی غلطی ہوتی ہے تو اس کے لیے بینکوں کو بھی ذمے دار ٹھہرایا جا سکتا ہے۔ اس لیے بینکوں کے لیے جو ہدایات جاری کی گئی ہیں وہ ڈی.ایس.اے. پر بھی لاگو ہوتی ہیں۔ اگر اب بھی ڈی. ایس.اے. آپ کو پریشان کر رہے ہیں تو کسی تاخیر کے بغیر مقامی پولیس اسٹیشن میں معاملہ درج کرا دیجیے، ساتھ ہی اس کی شکایت ریزرو بینک تک بھی پہنچائیے۔ بینکوں کو یہ ہدایت بھی دی گئی ہے کہ کسی گاہک سے رقم وصول کرنے کی ذمے داری کسی ڈی.ایس.اے. کو دینے سے پہلے اس کی منظوری گاہک سے لینی ہوگی۔

گاہکوں کے اختیارات: ریزرو بینک نے پہلی بار کریڈٹ کارڈ رکھنے والے صارفین کے اختیارات کی بھی وضاحت کر دی ہے۔ اس میں کہا گیا ہے کہ اگر بینک گاہک کی غلطی کے بغیر اس پر کوئی مالی جرمانہ لگا دیتا ہے تو بعد میں اصلیت معلوم ہونے پر گاہک کو دوگنی رقم واپس کرنی ہوگی۔ گاہکوں سے پوچھے بغیر ان کے خرچ کرنے کی حد بھی بینک اپنی سطح پر نہیں بڑھا سکتے ہیں۔ سبھی بینکوں کو ان گاہکوں کی فہرست تیار کرنے کو کہا گیا ہے جو نہیں چاہتے کہ بینک کی طرف سے انھیں کوئی کال کرے۔ اگر آپ نے بینک کو اس بارے میں صاف طور پر ہدایت دے دی ہے اور اس کے باوجود آپ کے پاس کال آ رہی ہے تو آپ اس بینک کے خلاف کارروائی کر سکتے ہیں۔

□□□

پتہ:
S/o Abdul Waris, Vill. Raja Tola, P.O. Harlakhi,
Madhubani, Bihar-847225

فرحان حنیف

شہریار سے بات چیت

فرحان حنیف: عام طور پر کوئی خوبصورت یا متاثر کن واقعہ یا حادثہ شاعری کا سبب بنتا ہے۔ کیا آپ کی زندگی میں بھی ایسا ہی کچھ ہوا جس نے شاعری کی طرف آپ کی رہنمائی کی؟

شہریار: نہیں، مجھے کوئی ایسا واقعہ یا حادثہ یاد نہیں ہے۔ میں نے کئی بار اس پہلو پر بھی غور کیا ہے۔ خود مجھے بھی یہ معلوم نہیں تھا کہ میں شاعری کر سکتا ہوں یا میں ایک دن شاعر بھی بن جاؤں گا۔ یہ سب محض اتفاق ہے۔

فرحان حنیف: لیکن کہیں سے تو آپ کو شاعری کی تحریک ملی ہوگی؟

شہریار: میرے خاندان میں دور دور تک کسی کا بھی شعر و ادب سے کوئی رشتہ نہیں تھا۔ زیادہ تر افراد جو پولیس محکمے میں ملازم تھے۔ میری پرسنلٹی کو دیکھتے ہوئے سبھی یہ سوچتے تھے کہ یہ پولیس آفیسر بنے گا۔ میرے والد صاحب کی بھی یہی خواہش تھی لیکن مجھے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ میں ہاکی کا کھلاڑی تھا اور اتھلیٹ بھی تھا۔ والدین نے اسی وجہ سے میری عمر بھی کچھ زیادہ لکھوائی تھی۔ میں نے گھر والوں کی خواہش سے بغاوت کر دی۔ فاصلے پیدا ہو گئے اور مجھے گھر چھوڑ کر الگ ہونا پڑا۔ 1955 میں میں خلیل الرحمٰن اعظمی کے ساتھ رہنے لگا اور باقی زندگی میں انھوں نے میری دیکھ بھال کی۔ خلیل الرحمٰن اعظمی صاحب کے ساتھ رہتے ہوئے مجھے شاعری کا شوق ہوا اور 1958 سے میں نے باقاعدہ شعر کہنا شروع کر دیا۔

فرحان حنیف: آپ کو اپنا پہلا شعر یا پہلی غزل یاد ہے؟

شہریار: کچھ بھی یاد نہیں ہے۔ دراصل میں نے کبھی کسی کام کے لیے کوئی منصوبہ بندی نہیں کی۔ مجھے زندگی میں ہر چیز اچانک ہی ملی ہے۔

فرحان حنیف: اردو شاعری کے تین ادوار/ ترقی پسند، جدیدیت اور مابعد جدیدیت پر کچھ روشنی ڈالیں؟

شہریار: میں ہر نئی سوچ اور نئی تحریک کی قدر کرتا ہوں اور قدر کرنی بھی چاہیے۔ کیونکہ ہر نئی سوچ کے کچھ اسباب بھی ہوتے ہیں۔ اسے دھیان میں رکھنا بھی ضروری ہے۔ ادب میں یہ تبدیلی تنقید کی سطح پر زیادہ ہوتی ہے۔ ترقی پسند شاعری، علامہ اقبال اور دوسرے شاعروں کی شاعری سے بہت زیادہ الگ بھی نہیں تھی۔ البتہ شاعری کو پرکھنے کے جو معیار تھے وہ تھوڑے مختلف تھے۔ ان معیاروں کی روشنی میں ادب لکھا گیا۔ اچھا ادب بھی لکھا گیا اور برا ادب بھی لکھا گیا۔ پھر تبدیلی کی ضرورت محسوس کی گئی تو جدید رجحان سامنے آیا۔ اس میں بھی تنقید کی سطح پر بہت زیادہ تبدیلی کا احساس ہوتا ہے۔ اب مابعد جدیدیت میں تنقیدی اصولوں پر بہت زیادہ زور دیا جا رہا ہے۔ یعنی تنقید بہت زیادہ اہم ہو گئی ہے اور تخلیق ابھی تلاش کی جا رہی ہے۔ مابعد جدیدیت کے اصولوں اور معیاروں کا اطلاق کن تخلیقات پر کیا جائے، انھیں ڈھونڈ ڈھونڈ کر سامنے لایا جا رہا ہے۔ جس طرح 1936 کے بعد والی شاعری کو ترقی پسند اور 1960 کے بعد والی شاعری کو جدیدیت سے جوڑا گیا، بالکل اسی طرح یہاں بھی تلاش جاری ہے۔ میری شاعری میں ایک سوشیل کمیٹمنٹ ہے اور شاید اسی سبب مجھے جدید شعرا کی فہرست میں شامل کیا گیا۔

فرحان حنیف: ایک طبقے کا یہ بھی کہنا ہے کہ غزل کا روایتی آہنگ جدت پسندی کی نذر ہو گیا ہے۔ کیا آپ بھی ایسا سمجھتے ہیں؟

شہریار: نہیں یہ بات غلط ہے۔ مشاعروں میں بھی جدید رنگ کی شاعری سنائی جاتی ہے۔ روایتی آہنگ تبدیل ہوتے روز و شب کے ساتھ بدلا ہے۔ الفاظ تبدیل ہوتے ہیں، احساس بدلتا ہے، جذبہ بھی بدلتا ہے، یہ فطری تقاضا بھی ہے۔

فرحان حنیف: آپ نے نثری نظمیں بھی لکھی ہیں، آج اردو شاعری کا ایک بڑا حلقہ نثری نظموں کی مخالفت کر رہا ہے، نثری نظموں کے متعلق آپ کے تاثرات کیا ہیں؟

شہریار: میں ذاتی طور پر نثری نظموں کا اعتراف کرتا ہوں اور اسے بھی ایک صنف سخن تسلیم کرتا ہوں لیکن نثری نظمیں ان شاعروں کو لکھنی چاہیے جو پابند شاعری بھی کرتے ہیں۔ میں نثری نظمیں لکھنے کا حق انھیں دیتا ہوں۔ ظاہر ہے جو موزوں شاعری پر دسترس رکھتے ہیں وہ نثری نظمیں بھی ذمے داری کے ساتھ لکھیں گے۔ جو بات موزوں شاعری میں وہ نہیں پیش کر سکتے اسے وہ نثری نظموں میں پیش کریں گے لیکن جو شعرا ایک بھی شعر موزوں نہیں کہہ سکتے انھیں نثری نظمیں بھی نہیں لکھنی چاہیے۔ میں کسی بھی تجربہ کو خوش آمدید کہتا ہوں۔ میں نے بھی نثری نظمیں لکھی ہیں، لیکن بہت زیادہ نہیں۔ میرے شعری مجموعے ''ساتواں در'' میں نثری نظمیں بھی شامل ہیں لیکن مجھے نثری نظمیں کہہ کر وہ اطمینان حاصل نہیں ہوا جو موزوں نظمیں لکھ کر حاصل ہوتا ہے۔

فرحان حنیف: آج کی اردو شاعری پر آپ کے تاثرات جاننا چاہوں گا؟

شہریار: آج اردو اور ہندی دونوں زبانوں کی شاعری کا حال ایک جیسا

ہی ہے۔ دیکھیے دو طرح کی شاعری ہوتی ہے۔ ایک وہ شاعری جو خوبصورت ہوتی ہے اور دنیا، ملک، معاشرے اور زندگی کے مسائل کو پیش کرتی ہے اور دوسری شاعری صرف تفریح کے لیے کی جاتی ہے۔ ایک وہ شاعری جو چھپتی ہے، ایک وہ شاعری جو سنی جاتی ہے۔ یہ بہت ہی واضح فرق ہے۔ مشاعروں اور ادبی سمیلنوں سے اردو اور ہندی شاعری کے متعلق کوئی رائے قائم کرنا مناسب نہیں ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ہمارے یہاں اتنا فرق ہو گیا ہے جو ہونا نہیں چاہیے تھا۔ سنجیدہ شاعری اور پاپولر شاعری دو اسٹریم ہو گئے ہیں۔ مشاعروں میں زیادہ تر ایسی شاعری پیش کی جاتی ہے جو صفحۂ قرطاس پر نہیں آتی۔ مشاعروں کے شاعروں کا مقصد بھی یہ نہیں ہے۔ انھیں صرف پاپولر ہونا ہے۔ تک بندی بھی عام ہو گئی ہے۔ اچھی شاعری تو خیر بہت بڑے پیمانے پر کبھی نہیں ہوئی۔ آج بھی نہیں ہو رہی ہے۔ چھوٹے پیمانے پر ہی سہی مگر ہو ضرور رہی ہے۔

فرحان حنیف: اردو شاعری نے کبھی انقلابات برپا کیے تھے مگر آج صرف مشاعروں کی حد تک محدود ہوتی جا رہی ہے؟

شہریار: آج دوسرے ذرائع بھی سامنے آ گئے ہیں۔ اخبار بھی موجود ہے، ٹیلی ویژن بھی ہے، ریڈیو بھی ہے۔ اب تو انٹرنیٹ بھی آ گیا ہے۔ لوگ باگ حالاتِ حاضرہ سے باخبر بھی ہیں۔ آپ شاعری کے ذریعے معاشرے پر طنز کریں یا نہ کریں، لوگوں کو ہر بات کی خبر ہے۔ ہر کوئی اپنی سہولت کے حساب سے زندگی گزارنا چاہتا ہے۔ ایثار، قربانی اور خلوص کا دور ختم ہو چکا ہے۔ ہر آدمی کو دنیا کی آسائش درکار ہے۔ بچوں میں بھی وہ Value System نہیں رہا کہ وہ اچھی چیزوں کو اچھے ذرائع سے حاصل کریں۔ پوری دنیا میں خرابی آئی ہے۔ اچھے لوگ بھی موجود ہیں اور برے لوگ بھی موجود ہیں۔ ویسے بھی اب شاعری سے انقلاب برپا کرنا ناممکن ہے۔ اس کے لیے دیگر ذرائع ہیں۔

فرحان حنیف: ہند و پاک میں جو شاعری ہو رہی ہے اس میں آپ کیا فرق محسوس کرتے ہیں؟ اور زیادہ بہتر شاعری کہاں ہو رہی ہے؟

شہریار: ہندوستان اور پاکستان دونوں ممالک میں اچھی شاعری ہو رہی ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ ہندوستان میں اچھی شاعری ہو رہی ہے اور پاکستان میں بری۔ یا پھر پاکستان میں اچھی شاعری ہو رہی ہے اور ہندوستان میں بری۔ دونوں ملکوں میں اچھی شاعری کی جا رہی ہے۔ دراصل پاکستان میں اب مشاعروں کا کوئی سسٹم نہیں رہا۔ وہاں ہندوستان کی طرح مشاعرے نہیں ہوتے۔ کچھ مشاعرے ہوتے تھے وہ بھی اب بند ہو چکے ہیں۔ سال میں ایک آدھ بار کوئی بڑا مشاعرہ مہاجروں کے ذریعے برپا کیا جاتا تھا، اب وہ بھی نہیں ہو رہا ہے۔ پوری دنیا میں جہاں بھی مشاعروں کا انعقاد عمل میں آتا ہے اس میں پاکستان کی نمائندگی وہی شعرا کرتے ہیں جو چھپتے ہیں۔ ان کی ادبی اہمیت بھی ہوتی ہے۔ اس کے برعکس ہمارے یہاں کے زیادہ تر وہ شعرا حصہ لیتے ہیں جن کا ادب میں کوئی مقام نہیں ہوتا ہے۔ باہر کے ممالک میں اس کی وجہ سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ ہندوستان میں اچھی شاعری نہیں ہو رہی ہے یا پھر بہت کم ہو رہی ہے۔ ہندوستان میں جو مشاعرے منعقد ہوتے ہیں، ان میں ناظمِ مشاعرہ پر پہلے غور کیا جاتا ہے۔ نظامت کس کی رکھی جائے؟ کتنے مزاحیہ شاعروں کو رکھا جائے؟ ترنم میں پڑھنے والے شاعر کتنے ہوں گے؟ کتنی خواتین کو رکھا جائے؟ بعد ازاں دو چار شاعروں کو رکھنے پر بھی غور کیا جاتا ہے۔ ادبی شاعروں پر توجہ نہیں دی جاتی۔

فرحان حنیف: مشاعرہ تو آپ بھی پڑھتے ہیں۔ مشاعرے کے اسٹیج پر جاتے وقت آپ کے احساسات کیا ہوتے ہیں؟

شہریار: شروع شروع میں تکلیف ہوتی تھی۔ سچائی تو یہ بھی ہے کہ میں اس طرح کے مشاعروں میں جا کر پچھتاتا بھی تھا۔ برا بھلا بھی کہتا تھا۔ اب عادت ہو گئی ہے۔ مشاعروں سے یہ فائدہ ہوتا ہے کہ آپ دنیا دیکھ لیتے ہیں۔ خود میں نے دنیا کے بیس بائیس ملکوں کا دورہ کیا ہے۔ امریکہ، فرانس، کینیڈا، اٹلی، دبئی، سعودی عرب، پاکستان، بیلجیم، قطر، بحرین اور دیگر کئی ممالک میں میں مشاعرے پڑھ چکا ہوں۔ مشاعروں میں دنیا کے دیگر ممالک کے شاعروں سے ملاقات کا موقع بھی ملتا ہے۔ عوام میں اردو کی مقبولیت مشاعروں کی وجہ سے بھی ہوئی ہے یہ بھی ایک سچائی ہے۔

فرحان حنیف: ہندوستان میں اردو کی جو مجموعی صورت حال ہے، کیا آپ اس سے مطمئن ہیں؟

شہریار: جی ہاں! ہندوستان میں اردو کی مجموعی صورت حال اچھی ہے۔ 1947 میں مجھے زیادہ ہوش نہیں تھا، پھر بھی کافی ہوش تھا۔ اس وقت جو حالات تھے اس سے خدشہ تھا کہ اردو اور مسلمان دونوں کا مستقبل تاریک ہوگا لیکن ایسا ہوا نہیں۔ میں نے وہ زمانہ دیکھا ہے۔ بوڑھے مسلمانوں کے لیے ٹرینوں میں الگ سے ڈبے مخصوص تھے اور وہ پولیس والوں کی نگرانی میں سفر کرتے تھے۔ علیگڑھ میں صرف ایک ہوٹل ایسا تھا جس میں کبھی کبھار مرغ کا گوشت مل جاتا تھا۔ آج ہر ہوٹل میں گوشت ملتا ہے۔ حالات بھی ویسے نہیں ہیں۔ کچھ علاقے بٹوارے سے قبل بھی ایسے تھے جہاں اردو کی حالت دگرگوں تھی اور آج بھی ہے۔ آج اتر پردیش میں اردو دوسری سرکاری زبان ہے مگر عام لوگوں میں اردو کے تئیں زیادہ دلچسپی نہیں ہے۔ بہار اور مہاراشٹر میں اردو کی صورت حال اچھی ہے۔ اردو میڈیم کے اسکولوں کی تعداد بھی زیادہ ہے۔ دوسری ریاستوں میں بہتر صورت حال ہے۔ آج اردو صرف اردو والوں کے سبب سے پیچھے ہے۔ اردو والوں کو جس طرح سے دلچسپی لینی چاہیے وہ اتنی دلچسپی نہیں لے رہے

ہیں۔ ہندوستان میں سرکار اردو کے فروغ کے لیے جو رقم خرچ کر رہی ہے، پاکستان میں بھی اتنا پیسہ خرچ نہیں کیا جاتا۔ ہندوستان میں ہر یونیورسٹی میں اردو ڈپارٹمنٹ قائم ہے۔ اسکول اور کالج ہیں۔ اردو اکادمیاں ہیں۔ ہم ان کا صحیح استعمال نہیں کر پا رہے ہیں۔ یہ بالکل ایماندارانہ بات ہے، اردو کو اب کسی سے کوئی خطرہ نہیں ہے، سوائے اردو والوں کے۔ آندھرا پردیش میں بھی اردو ترقی کر رہی ہے۔ مجموعی طور پر ہندوستان میں اردو کی صورتِ حال بری نہیں ہے۔ جوں جوں وقت گزرتا جائے گا صورتِ حال اور بھی بہتر ہوتی جائے گی۔ خود ان لوگوں نے جنھوں نے اردو کے ساتھ تعصب برتا ہے، انھیں اب یہ احساس ہونے لگا ہے کہ اردو ہندوستانی زبان ہے اور اس کے ساتھ ناانصافی برتی گئی ہے۔

فرحان حنیف: اردو رسم الخط میں تبدیلی کے لیے بھی آوازیں اٹھائی جاتی ہیں۔ کیا اردو کا رسم الخط تبدیل کیا جانا چاہیے؟

شہریار: ایسی آوازوں پر توجہ دینے کی ضرورت نہیں ہے۔ دیکھیے لباس ہی سے آدمی کی پہچان بنتی ہے۔ اردو کی پہچان بھی اس کے رسم الخط سے ہے۔ اردو کے تمام بڑے ادیبوں اور شاعروں کی تخلیقات دیوناگری رسم الخط میں موجود ہیں۔ اگر آپ کو اردو سے محبت ہے تو پہلے اپنے نصاب میں اردو کے ادیبوں اور شاعروں کو بھی شامل کیجیے۔ اردو ایک زندہ اور متحرک زبان ہے۔ میں اردو رسم الخط میں تبدیلی کے خلاف ہوں۔

فرحان حنیف: آپ کی فلمی شاعری کے بارے میں بھی گفتگو ہونا ضروری ہے۔ کیا فلموں میں لکھنے کا موقع بھی محض اتفاق تھا یا پھر آپ نے باقاعدہ کوئی پلاننگ کی تھی؟

شہریار: میری زندگی میں سب کچھ اچانک ہی ہوا ہے۔ میں نے کوئی بھی کام پلاننگ کے تحت نہیں کیا۔ مظفر علی سے میرے مراسم تھے۔ انھیں مصوری کا شوق تھا۔ انھوں نے جب فلم ''گمن'' کا منصوبہ تیار کیا اور مجھ سے اس میں گیت لکھنے کی فرمائش کی، میں راضی ہوگیا۔ ''گمن'' میں میری دو غزلیں شامل تھیں۔ ''سینے میں جلن، آنکھوں میں طوفان سا کیوں ہے'' اور ''عجیب سانحہ مجھ پر گزر گیا یارو''۔

بعد ازاں مظفر علی نے لکھنؤ کے ماحول پر فلم بنانے کا ارادہ ظاہر کیا۔ میں چونکہ لکشن پڑھا رہا تھا اس لیے میں نے انھیں ''امراؤ جان ادا'' بنانے کا مشورہ دیا۔ ''امراؤ جان'' میں میرے پانچ گیت شامل تھے۔ اس فلم کے کئی مناظر میں میرے اشعار بھی موجود ہیں۔ یش چوپڑہ کی فلم ''فاصلے'' میں بھی میرے گیت شامل تھے۔ مظفر علی کی فلم ''انجمن'' کے لیے بھی میں نے گیت لکھے ہیں۔ ''دامن'' اور ''نروتی'' نامی دو فلمیں تکمیل کے مرحلے تک نہیں پہنچ سکیں۔

(بشکریہ ''اردو چینل''، ستمبر، 2007)

جتنے پاس اتنے دور

مصنف: دھیریندر سنگھ جفا

''جتنے پاس اتنے دور'' انڈین فائٹر پائلٹ کی آپ بیتی ہے جو ناول کے اسلوب میں لکھی گئی ہے۔ یہ کتاب دھیریندر سنگھ جفا نے پہلے انگریزی میں لکھی بعد میں ڈی۔گہانے اسے بنگلہ میں ترجمہ کیا، پھر ہندی ترجمہ خود مصنف نے اپنے دوست سید مزمل فدا کے تعاون سے کیا اور اب اردو ترجمہ جناب شاہد جمال نے کیا ہے جسے قومی اردو کونسل نے حال ہی میں شائع کیا ہے۔

اس آپ بیتی میں 1970 سے 1972 تک ہندوستان اور پاکستان کی جنگوں کے توسط سے تقسیم شدہ ہندوستان کے ٹوٹے بکھرے دلوں کی آہوں اور کراہوں کو بڑی صفائی اور صدق دلی سے بیان کیا گیا ہے۔ یہ کتاب اپنے ملک کی حفاظت اور انسانی رواداری کے باب میں ہمارے جذبے اور احساس پر گہرے اثرات مرتسم کرتی ہے۔

صفحات: 270، قیمت -/145 روپے

نوٹ: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کی جانب سے طلبہ اور اساتذہ کے لیے بالترتیب 45% اور 40% کی خصوصی رعایت دی جاتی ہے۔ تاجران کتب کو قومی اردو کونسل کے ضوابط کے مطابق رعایت دستیاب ہے۔ ادارہ

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک-8، ونگ-7، آر۔کے۔ پورم، نئی دہلی-110066

فضیل جعفری (ہماری مطبوعات سے)

غلام عباس کا افسانوی ادب

شاعروں کی طرح افسانہ نگاروں میں بھی ایک عام کمزوری یہ پائی جاتی ہے کہ جیسے جیسے ان کی عمر بڑھتی ہے وہ اپنے آپ کو دہرانے کے عمل میں گرفتار ہوتے چلے جاتے ہیں۔ بسا اوقات موضوعات کے ساتھ ساتھ پیش کش کے انداز میں بھی یکسانیت در آتی ہے۔ اردو کے صفِ اوّل کے افسانہ نگاروں میں منٹو اور کرشن چندر اس سلسلے میں سامنے کی مثالیں ہیں۔ کسی نہ کسی حد تک قرۃ العین حیدر پر بھی یہ مفروضہ صادق آتا ہے۔ لیکن آخر یہی لوگ کیوں؟ موپاساں اور مام جیسے اساتذۂ فن بھی اس کمزوری سے اپنا دامن نہیں بچا سکے۔ چنانچہ میرے نزدیک یہ کمزوری بڑے اور اہم افسانہ نگاروں کی مجموعی قدو قامت پر چھینٹے اڑانے میں تو کامیاب ہوسکتی ہے لیکن ان کے قد کو گھٹانے کی قدرت نہیں رکھتی۔ البتہ وہ افسانہ نگار جو اس کمزوری سے اپنا دامن بچالے جانے کی سکت اور ہمت کے مالک ہوتے ہیں وہ یقیناً زیادہ فائدے میں رہتے ہیں۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ ایسا وہی لوگ کر پاتے ہیں جو اچھا لکھنے کے ساتھ ساتھ نسبتاً کم لکھتے ہیں۔ کم لکھنے کے اپنے الگ نقصانات ہیں۔ اس تعلق سے نیز اردو افسانے کے مجموعی پس منظر میں راجندر سنگھ بیدی اور غلام عباس کے نام خصوصی طور سے لیے جاسکتے ہیں۔

ان دونوں نے اپنے مشہور ہم عصروں کے مقابلے میں نسبتاً کم لکھا اور وقتی طور پر سہی لیکن بہرحال خسارے میں رہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک زمانے تک بیدی کا نام کرشن اور منٹو کے بعد ہی نہیں عصمت چغتائی تک کے بعد لیا جاتا تھا۔ اور یہ کام ہما شما نہیں آل احمد سرور جیسے مشاہیر کرتے تھے۔ جہاں تک بیدی کا معاملہ ہے، گزشتہ چند برسوں میں ان کی افسانوی حیثیت انقلابی تبدیلیوں سے دوچار ہوئی ہے۔ اس عرصے میں ان کے افسانوی فن کو پرکھنے اور سمجھنے کی نہ صرف سنجیدہ کوششیں کی گئی ہیں بلکہ نقادوں کا ایک ایسا گروہ بھی پیدا ہوگیا ہے جو انھیں منٹو، کرشن اور عصمت پر ترجیح دیتا ہے۔

اس کے برعکس غلام عباس پر نظر ڈالیے تو پتہ چلتا ہے کہ اگرچہ ممتاز شیریں سے لے کر وارث علوی تک فکشن کے سبھی اہم نقاد، ان کا نام بیدی، منٹو اور کرشن وغیرہ کے ساتھ لیتے رہے ہیں لیکن نہ تو ان کے بارے میں کسی نے تفصیل کے ساتھ کچھ لکھا اور نہ انھیں وہ عوامی مقبولیت حاصل ہوسکی جس کے وہ مستحق تھے اور ہیں۔ اس تعلق سے محمد حسن عسکری کا خیال ہے کہ چونکہ غلام عباس اوسطاً سال بھر میں صرف ایک افسانہ لکھتے تھے اس لیے وہ اپنے دوسرے ہم عصروں کی طرح مقبول نہ ہوسکے۔

میری رائے میں عوامی سطح پر اس عدم مقبولیت کا ایک بڑا سبب یہ بھی ہے کہ 1936 کے بعد کا افسانوی ادب دو مرکزی دھاروں میں تقسیم ہوگیا تھا۔ اپنی اپنی انفرادی خصوصیات کے باوجود اس وقت کے سبھی اور قابلِ ذکر افسانہ نگار یا تو سماجی حقیقت نگاری کے حوالے سے پہچانے جاتے تھے یا پھر ان کے ہاتھ میں جنسی حقیقت نگاری کا جھنڈا ہوتا تھا۔ چنانچہ روایتی طور پر اگر بیدی، کرشن، قاسمی اور اشک وغیرہ کے نام پہلے گروہ سے وابستہ ہوگئے تو دوسری طرف منٹو، حسن عسکری، عصمت چغتائی اور عزیز احمد وغیرہ کو دوسرے گروہ کا نمائندہ سمجھا جانے لگا۔ ویسے اس مفروضے کو قطعاً کسی منطقی کلیے سے تعبیر نہیں کیا جاسکتا۔ مثال کے طور پر اگر منٹو کے بعض افسانے سماجی حقیقت نگاری کے میدان میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتے ہیں تو دوسری طرف بیدی نے اپنے کئی افسانوں میں نفسیاتی اور جنسی حقیقت نگاری کو ایک نئی افسانوی معنویت بخش دی ہے۔

غلام عباس ساری زندگی اپنے انفرادی جوہر پر زور دینے کے قائل رہے۔ انھوں نے ابتدا سے ہی اور بطور اصول، اپنے آپ کو کسی ادبی گروہ یا تحریک سے منسلک نہیں کیا۔ جہاں تک سماجی اور معاشرتی اقدار کا سوال ہے وہ ان کے افسانوں میں بھی بنیادی حیثیت کی حامل ہیں۔ اسی طرح نہ صرف یہ کہ انھوں نے جنسی مسائل کو اپنے لیے کبھی شجرِ ممنوعہ نہیں سمجھا بلکہ یہ بھی کہ انھوں نے ان مسائل کو اپنے کئی افسانوں کا موضوع بنایا ہے۔ یہ بات ضرور ہے کہ وہ ان مسائل کی پیش کش میں منٹو کی طرح جذباتیت کی لہر پر بہہ جانے کے بجائے محتاط، سست رفتار رویے کا اظہار کرتے ہیں۔ سب جانتے ہیں کہ 1936 کے بعد والے دور میں "سیاست" اور "صحت مند معاشرہ" ادب کی کلیدی اصطلاحیں ہوا کرتی تھیں۔ اس تعلق سے بحث کرتے ہوئے غلام عباس نے لکھا ہے کہ۔

"ہر ادیب صحت مند معاشرہ چاہتا ہے۔ وہ ادیب نہیں جو معاشرے پر

"آبشار اور آتش فشاں" سے ماخوذ، مصنف: **فضیل جعفری** / صفحات: 368 ، قیمت : -/160 روپئے

نوٹ : قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی جانب سے طلبہ اور اساتذہ کے لیے بالترتیب 45% اور 40% کی خصوصی رعایت دی جاتی ہے۔ تاجران کتب کو قومی اردو کونسل کے ضوابط کے مطابق رعایت دستیاب ہے۔ ادارہ

تنقید نہ کرے لیکن تحریک بنا کر اس کے پیچھے پڑ جانا اصولی بات نہیں۔ ترقی پسندی ادب سے زیادہ سیاسی تحریک تھی۔''

اب یہ الگ بات ہے کہ غلام عباس خود اپنے وضع کردہ اس اصول پر سختی کے ساتھ عمل نہیں کر پائے۔ انھوں نے تنگ نظر پاکستانی اور مسلم لیگی سیاست کے زیر اثر ''لچک'' اور ''اوتار'' جیسے جو افسانے رقم کیے انھیں سستے اور محدود سیاسی پروپگنڈے کے علاوہ اور کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ ساتھ ہی ساتھ یہ بات بھی اپنی جگہ طے ہے کہ ان افسانوں کی سطحیت غلام عباس کے افسانوی ادب کی عمومی سطح کو مجروح نہیں کرتی۔

اپنے افسانوی رویے کی تشریح کرتے ہوئے غلام عباس ایک اور جگہ یوں رقمطراز ہیں۔

''میں لوگوں کے لیے نہیں لکھتا، اور نہ ہی بیرونی نظریات اور سیاست میرے پیش نظر ہوتی ہے۔ مجھے کبھی پرواہ نہیں ہوتی کہ میری کہانی مقبولیت حاصل کرتی ہے یا نہیں۔ میں صرف اپنے لیے لکھتا ہوں۔ بالکل اسی طرح جس طرح ایک ماہر موسیقار اسٹیج پر بھی ستار بجا کر ذاتی تسکین حاصل کرتا ہے.... یہ الگ بات ہے کہ اسے سن کر دوسرے بھی تسکین حاصل کر لیتے ہیں یا کر سکتے ہیں۔'' (روزنامہ ''حریت'' کراچی۔ 16 جون 1981)

غلام عباس نے یہ بات 1981 میں کہی لیکن سچ پوچھیے تو فن کے تعلق سے ابتدا سے ہی ان کا یہی رویہ تھا۔ اگر اس رویے کو ایک پرانے کلیشے کی مدد سے بیان کیا جائے تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ فنکار کا بنیادی کٹ منٹ خود اپنی ذات سے ہوتا ہے۔ لیکن اگر اسی بات کو ہم قدرے مختلف انداز میں کہنا چاہیں تو پھر کہیں گے کہ ہر حقیقی فنکار کے پاس زندگی اور اس کے مختلف مظاہر کے بارے میں کچھ نظریات ہوتے ہیں۔ وہ اپنے نظریوں کا احترام بھی کرتا ہے اور حسب ضرورت ان کا فنی اظہار بھی کرتا ہے لیکن نظریات کی تشہیر اس کا فنی مقصد نہیں ہوتا کیوں کہ اس طرح اس کے فن کا دائرہ محدود ہوتا جاتا ہے۔

فنکار کا اپنی ذات کے ساتھ کٹ منٹ ہونے کا مطلب بے کراں وسعتوں سے ہم کنار ہونا ہوتا ہے۔ فنکار کی ذات چونکہ مجمع البحرین بھی ہوتی ہے اور مجمع الضدین بھی اس لیے اپنی ذات سے کمیٹڈ فنکار کے سامنے خیالات، موضوعات، لفظیات اور اسالیب کا پورا شہر کا شہر آباد ہوتا ہے اس کی نگاہیں کبھی کسی کھڑکی پر جم جاتی ہیں تو کبھی وہ دروازے کے پیچھے آباد دنیا کے اسرار و رموز کو دریافت کرتا ہے، کبھی اسے کسی عمارت کی بوسیدگی پسند آتی ہے تو کبھی وہ عمارت کے مکینوں کے دلوں میں جھانک کر ان اچھے، برے، شریفانہ اور غیر شریفانہ جذبات کو دیکھ لیتا ہے جو عام آدمیوں کی نظروں سے اوجھل رہتے ہیں۔

اب جہاں تک مقصدیت کا سوال ہے وہ ہر فن پارے میں کسی نہ کسی شکل میں موجود رہتی ہے۔ غلام عباس نے بھی فن کی مقصدیت سے کبھی انکار نہیں کیا بلکہ ان کا تو ایقان تھا کہ مقصد کے بغیر کوئی کہانی لکھی ہی نہیں جا سکتی۔ ہاں وہ جدید ادیبوں اور شاعروں کی طرح ادب کی مقصدیت اور ادب کے ذریعے سیاسی پروپگنڈے میں فرق کرنے کے قائل تھے۔ اسی لیے وہ کرشن چندر کو پسند بھی کرتے تھے اور ان کی خالص پروپگنڈے والی کہانیوں کو ناپسند بھی کرتے تھے۔ انھیں اس بات کا افسوس تھا کہ کرشن چندر کی بعض بیحد اہم کہانیاں مثلاً ''کالو بھنگی''، ''بت جاگتے ہیں'' اور ''مہالکشمی کا پل'' اپنے مجموعی فنکارانہ فریم ورک کے باوجود سیاسی پروپگنڈے کا شکار ہو کر رہ گئیں۔

غلام عباس کی افسانہ نگاری کا آغاز 1932 میں ہوا۔ اس وقت ان کی عمر بہ مشکل اکتیس بتیس سال تھی۔ افسانوی ادب کی نشر و اشاعت کے سلسلے میں اس دور میں حکیم احمد شجاع کے رسالے ''ہزار داستان'' کو خاصی شہرت اور مقبولیت حاصل تھی۔ عباس نے سب سے پہلے اسی رسالے کے لیے ٹالسٹائی کے مشہور افسانے ''جلاوطن'' کا ترجمہ کیا تھا۔ بقول خود ان کا پہلا طبع زاد افسانہ ''مجسمہ'' ماہنامہ ''کارواں'' کے سالنامے میں شائع ہوا تھا۔ یہ افسانہ مجھے ان کے کسی مجموعے میں نظر نہیں آیا۔ بحیثیت افسانہ نگار، غلام عباس کو جس افسانے سے غیر معمولی شہرت ملی وہ ہے ''آنندی''۔ انتظار حسین نے ''آنندی'' کو سماجی حقیقت نگاری کا نقطۂ عروج قرار دیا ہے۔ بقول انتظار صاحب یہ افسانہ اس وقت لکھا گیا ''جب اردو میں حقیقت نگاری کا شور تو بہت تھا لیکن رومانی افسانہ اس کا پیچھا نہیں چھوڑ رہا تھا۔ لیکن غلام عباس تو رومانی افسانے کو بہت پہلے ہی نیا پرانا کر چکے تھے۔''

ن۔م۔ راشد کا خیال ہے کہ ''آنندی'' کی اشاعت کے ساتھ ہی غلام عباس کا شمار بڑے افسانہ نگاروں میں ہونے لگا تھا۔ راشد کے نزدیک اس عظمت کا حقیقی سبب یہ ہے کہ:

''غلام عباس منٹو کی طرح زندگی کے بخیے نہیں ادھیڑتا، وہ عسکری کی طرح کم عمری میں بالغ ہو جانے والے بچے کی طرح چھپے روزنوں میں سے زندگی کو نیم برہنہ نہیں دیکھتا، وہ عزیز احمد کی طرح ناکام معلم بن کر کسی فاسد انا کی تسکین نہیں کرتا۔''..... (دیباچہ۔ ''جاڑے کی چاندنی'')

میں سردست راشد کے مندرجہ بالا رویے پر کسی تفصیلی بحث کے موقف میں نہیں ہوں۔ محض یہ لکھ کر آگے بڑھ جانا چاہتا ہوں کہ غلام عباس کو نہ راشد کی طرف سے عطا کی جانے والی خلعت فاخرہ سے کوئی فائدہ پہنچا اور نہ قارئین نے ان کی اس رائے کا کوئی نوٹس لیا۔ جہاں تک میرا معاملہ ہے مجھے راشد کی تمام تر شعری عظمت کے باوجود فکشن ہی نہیں خود شاعری کے بارے میں ان کی تنقیدی بصیرت خاصی مشکوک نظر آتی ہے۔ انھوں نے اپنے مضامین میں یہاں

وہاں فراق، یگانہ اور کئی دوسرے شاعروں کے بارے میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے انھیں پڑھ کر یہ شک یقین میں بدل جاتا ہے۔

افسانے کے بارے میں راشد کی تنقیدی بصیرت تقریباً صفر تھی۔ چنانچہ ''جاڑے کی چاندنی'' کے دیباچے میں انھوں نے جو کچھ بھی لکھا ہے اسے پڑھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے گویا ان کا اصل مقصد غلام عباس کی تعریف و توصیف سے زیادہ منٹو، عسکری اور عزیز احمد سے (غالباً) اپنی کسی ذاتی رنجش کا انتقام لینا تھا۔ یہاں بر سبیل تذکرہ یہ بھی لکھ دوں کہ عسکری صاحب غلام عباس کے دو تین سب سے زیادہ پسندیدہ افسانہ نگاروں میں سے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ مختصر افسانے کے استاذ الاساتذہ چیخف سے (اردو کی حد تک) یا تو خود متاثر ہوئے ہیں یا پھر عسکری صاحب۔ اس بارے میں انتظار حسین کا کہنا ہے کہ چیخف تک تو غلام عباس اور عسکری ساتھ ساتھ چلے لیکن آگے چل کر دونوں کے راستے الگ الگ ہو گئے۔ دوسرے لفظوں میں اس کا مطلب یہ ہوا کہ غلام عباس نے تو ایک وفادار شاگرد کی طرح چیخف کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا لیکن عسکری صاحب راستے سے بھٹک کر مارسل پروست اور جیمز جوئس کی طرف نکل گئے۔

سچ تو یہ ہے کہ عسکری صاحب کے یہاں چیخف کا اثر ہی نہیں اس کی تقلید کا بھی رجحان دکھائی دیتا ہے جبکہ غلام عباس وسیع تر تخلیقی سطح پر چیخف سے متاثر ضرور ہوئے لیکن انھوں نے شعوری طور سے اس عظیم افسانہ نگار کی تقلید نہیں کی۔ دراصل انھوں نے کسی کی بھی تقلید نہیں کی اور اسی حقیقت میں ان کی انفرادیت کا راز مضمر ہے۔

شمیم احمد نے اپنے مضمون ''غلام عباس کے افسانے'' (مطبوعہ ''دائرے'' کراچی جولائی/اگست 1991) میں جہاں غلام عباس کے افسانوی ادب سے متعلق سو طرح کی دوسری اوٹ پٹانگ باتیں لکھی ہیں وہاں یہ زبردست انکشاف بھی فرمایا ہے کہ پطرس، تاثیر، محمد حسن عسکری وغیرہ غلام عباس کے دوست ہی نہیں ''ادبی مشیر'' بھی تھے۔ یہ لوگ غلام عباس کو مختلف موضوعات دیا کرتے تھے جن کی بنیاد پر عباس صاحب افسانوی شہکار تو تخلیق کر دیتے تھے لیکن انھیں یہ معلوم بھی نہیں ہوتا تھا کہ ان کے اکثر افسانے کسی نہ کسی ''مغربی تخلیق سے ماخوذ ہوتے تھے۔'' شمیم احمد کا یہ الزام نہ صرف بچکانہ بلکہ بدنیتی پر مبنی ہے۔ غلام عباس کا پہلا افسانوی مجموعہ ''آنندی'' 1947 میں منظرِ عام پر آیا تھا۔ اس میں کل 10 افسانے ہیں۔ دوسرے مجموعے ''جاڑے کی چاندنی'' (طبع اول 1960) میں 14 افسانے ہیں۔ تیسرا مجموعہ ''کن رس'' پہلی بار 1969 میں شائع ہوا۔ اس مجموعے میں صرف 9 افسانے ہیں۔ بعد ازاں انھوں نے چند اور افسانے مثلاً ''بندر والا''، ''روحی'' اور ''رینگنے والے'' لکھے۔ ایک عام اندازے کے مطابق غلام عباس کے افسانوں کی مجموعی تعداد 40-45 سے زیادہ نہیں ہے۔ آپ چاہیں تو اس فہرست میں ''گوندنی والا تکیہ'' اور ''دھنک'' کو بھی شامل کر لیں۔

مطلب یہ کہ غلام عباس پر اتنا سنگین الزام لگانے سے قبل شمیم احمد کا فرض تھا کہ وہ اپنے مفروضے کے ثبوت میں قابل قبول شواہد فراہم کرتے۔ عباس کے افسانوں کی مختصر سی تعداد کے مدِنظر یہ کوئی مشکل کام بھی نہیں تھا۔ لیکن شمیم احمد نے اس پس منظر میں محض ایک افسانے ''ناک کاٹنے والے'' کا نام لیا ہے جو ان کے نزدیک مولیئر کے کسی ڈرامے سے ماخوذ ہے۔ اس سلسلے میں بھی موصوف کی احتیاط کا یہ عالم ہے کہ انھوں نے مولیئر کے ڈرامے کا نام نہیں بتایا۔ ہمارے نزدیک شمیم احمد کی یہ الزام تراشی ایماندارانہ ادبی تنقید کے منافی ہے۔

دنیا کے بڑے بڑے لکھنے والوں سے متاثر ہونے کی بات الگ ہے۔ غلام عباس نے قدیم اردو داستانوں سے لے کر جدید مغربی افسانوی ادب تک کا بغور اور بالاستیعاب مطالعہ کیا تھا۔ وہ بھی درجنوں دوسرے اہم لکھنے والوں کے مانند موپاساں اور چیخف کو دنیا کے عظیم ترین افسانہ نگار سمجھتے تھے لیکن ساتھ ہی ساتھ وہ ٹالسٹائے کے افسانے Death of Ivan ilych جوئس کے The Dead لارنس کے The Woman who Rode away اور آئیون بنن کے Gentleman from Fransisco کو بھی دنیا کے عظیم افسانوں میں شمار کرتے تھے۔ اس کے باوجود غلام عباس کی کسی تخلیق پر ان عظیم تحریروں کی کوئی قابل شناخت چھاپ نظر نہیں آتی۔

غلام عباس کے جو آدھے درجن کے قریب انٹرویو میری نظر سے گزرے ہیں ان کی بنا پر آسانی کے ساتھ یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ اردو افسانے کو یورپی اور بین الاقوامی افسانوں کے معیار کی کسوٹی پر رکھ کر پرکھنے کے قائل تھے۔ اس حد تک کہ اگر وہ اپنے لیے کسی موضوع کا انتخاب کرتے اور اتفاقیہ طور سے انھیں کسی مغربی زبان میں اس موضوع پر یا پھر اس سے ملتے جلتے ہوئے موضوع پر بھی کوئی افسانہ نظر آ جاتا تو وہ اس موضوع کو فوراً ترک کر دیتے۔ اردو افسانوں کے تعلق سے بھی ان کا یہی رویہ تھا۔ انھوں نے کبھی اپنے کسی ہم عصر کے کسی کامیاب افسانے کو سامنے رکھ کر کوئی افسانہ نہیں لکھا۔ اس معاملے میں ان کی سخت گیری کا یہ عالم تھا کہ وہ اگر خود کسی موضوع پر ایک بار افسانہ لکھ دیتے تو پھر متعلقہ موضوع خواہ کتنا ہی کشادہ کیوں نہ ہو، وہ اسے دہرانا پسند نہیں کرتے تھے۔

افسانہ نگاری کے سلسلے میں غلام عباس کا ایقان تھا کہ افسانہ نگار کو وہی لکھنا چاہیے جو اس کے اپنے تجربے اور مشاہدے پر مبنی ہو۔ یہاں بطور وضاحت یہ عرض کر دوں کہ افسانوی ادب کے تناظر میں مشاہدے اور ذاتی تجربے کا مطلب ہرگز یہ نہیں ہوتا کہ ہر واقعہ خود افسانہ نگار پر گزرا ہو۔ تجربات وسیلہ در وسیلہ بھی افسانہ نگار تک پہنچتے ہیں۔ کسی کا سنایا ہوا کوئی واقعہ یا اخبار میں شائع

ہونے والی کوئی خبر بھی تخیل کی مدد سے افسانہ نگار یا ناول نگار کا ذاتی تجربہ بن جاتی ہے۔

مثال کے طور پر بین الاقوامی شہرت یافتہ ناول نگار جوزف کونریڈ کا دعویٰ ہے کہ اس نے اپنا جنوبی امریکی ناول Nostromo اپنے ذاتی تجربات کی بنیاد پر لکھا ہے۔ اب اگر منطقی طور پر دیکھا جائے تو کونریڈ ساری زندگی جنوبی امریکہ نہیں گیا۔ ہاں وہ نوعمری میں میکسیکو کے بندرگاہ تک ضرور گیا تھا جہاں کسی نے اسے ایک کہانی سنائی تھی۔ کونریڈ کا کمال یہی ہے کہ اس نے اس کہانی کو بنیاد بنا کر جو ناول لکھا اسے پڑھ کر آپ جنوبی امریکہ کے بارے میں سب کچھ جان لیتے ہیں۔ اسی طرح جیلانی بانو نے یہ انکشاف کیا ہے کہ ان کی کہانی ''نرسیا کی بادلی'' کا ماخذ دراصل ایک اخباری خبر ہے جسے ان کے افسانوی تخیل نے ذاتی تجربے کی شکل عطا کردی ہے۔ اس افسانے پر بننے والی ٹی۔ وی فلم بھی بڑی مقبول ہوئی۔

چنانچہ غلام عباس جب یہ بات بہ اصرار کہتے ہیں کہ ان کا ہر افسانہ ان کے ذاتی تجربے یا مشاہدے پر مبنی ہوتا ہے یا یہ کہ وہ اپنی کہانیوں کا مرکزی کردار خود ہوتے ہیں تو اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ وہ اپنے کسی افسانے کے لیے زندگی کی جس ''قاش'' کا بھی انتخاب کرتے ہیں اس کا تعلق عمومی انسانی رویوں سے زیادہ ان کی اپنی انفرادی حسیت اور افسانوی تخیل و تجربے کی ندرت سے ہوتا ہے۔

جہاں تک لفظی معنی میں ذاتی تجربے کا تعلق ہے انھوں نے اپنے ایک افسانے ''اوورکوٹ'' کی بطور خاص نشاندہی کی ہے:

''اس کہانی کا خیال یوں سوجھا کہ دہلی میں ایک بار گئی رات ہم ایک موٹر میں نظام الدین اولیاءؒ کو جانے والی سڑک پر چلے جارہے تھے۔ مقصد محض تفریح اور گپ بازی تھا۔ کار پطرس بخاری چلا رہے تھے اور کار کے دوسرے مسافروں میں تاثیر، فیض، کرتل مجید اور خاکسار شامل تھا۔ میں نے اوورکوٹ پہن رکھا تھا۔ یہ اوورکوٹ اور مفلر بالکل ظاہر نہیں ہونے دیتے تھے کہ میں نے صرف پٹھا ہوا نیان اور پاجامہ پہن رکھا تھا۔ موٹر چلی جارہی تھی اور شعروشاعری پر دلچسپ بحث ہورہی تھی کہ اتنے میں سڑک کے بیچوں بیچ ایک ٹرک کچھ زیادہ تیز رفتاری سے سامنے آگیا۔ اگر پطرس صاحب جلدی سے موٹر ایک طرف نہ کرلیتے تو ٹکر ہوجانے میں کوئی کسر نہ رہ جاتی۔

مجھے خیال آیا کہ فرض کرو کہ اگر ٹکر ہوگئی ہوتی تو ہم سب لوگ مرے پڑے ہوتے یا زخمی۔ ہمیں اس حالت میں اسپتال پہنچایا جاتا تو دیکھنے والے یہ دیکھ کر حیران ہوجاتے کہ سب لوگ تو ٹھیک ٹھاک ہیں لیکن ایک شخص نے عجیب حلیہ بنا رکھا ہے کہ اوپر سے قیمتی کوٹ اور مفلر ہے اور اندر پٹھا ہوا نیان اور پاجامہ.....''

غلام عباس نے اس مخصوص صورت حال کو افسانوی تخیل، استعاراتی بیانیہ اور حسی پیکر تراشی کی مدد سے ایک ایسی تخلیقی شکل عطا کردی ہے جو متذکرہ بالا سیاق و سباق سے تھوڑی بہت یا یوں سمجھیے کہ اشاراتی مطابقت و مشابہت رکھنے کے باوجود ایک نرالی شان اور گہرے تاثر کی حامل ہے۔ یہ حقیقت اس بات کا بھی ثبوت ہے کہ غلام عباس ان افسانہ نگاروں سے قطعاً الگ ہیں جو اپنے تجربات کو نہایت ہی معصومیت کے ساتھ سیدھے سادے انداز میں اگل دیتے ہیں۔ عباس انسانی صورت حال کو نہ صرف بدل دینے پر قادر ہیں بلکہ اسے ہم عصر معاشرتی پس منظر میں بیان کرکے قاری اور تخلیق کے درمیان وہ داخلی ربط بھی قائم کردیتے ہیں جو افسانے کو ذاتی دستاویز بنا دیتا ہے۔

''اوورکوٹ'' کا ہیرو نام اور نوجوان ہیرو بظاہر خاصا فیشن ایبل بلکہ ارسٹو کریٹ نظر آتا ہے۔ بادامی رنگ کے اوورکوٹ کے کاج میں شربتی رنگ کا ایک عدد ادھ کھلا پھول اٹکا ہوا ہے۔ کوٹ کے رنگ کی مناسبت سے سر پر سبز فلیٹ ہیٹ ایک خاص انداز میں ٹیڑھی رکھی ہوئی ہے۔ گلے کے گرد سفید ریشمی گلوبند لپٹا ہوا ہے۔ یہ نوجوان ایک ہاتھ کوٹ کی جیب میں ڈالے ہوئے اور دوسرے ہاتھ میں بید کی ایک چھوٹی سی چھڑی پکڑے ہوئے شہر کے مرکزی بازار سے گزرتا ہے۔ ان تمام چیزوں کو گہری افسانوی معنویت عطا کرنے کی غرض سے غلام عباس نے ماحول کشی سے بلکہ خوبصورت اور موثر ماحول آفرینی سے کام لیا ہے۔ یہ پیراگراف ملاحظہ ہو:

''اس وقت شام کے اندھیرے کے ساتھ سردی اور بھی بڑھتی جارہی تھی۔ اس کی یہ شدت ناخوشگوار نہ تھی بلکہ لذت پرستی کی ترغیب دیتی تھی۔ شہر کے عیش پسند طبقے کا تو کہنا ہی کیا، وہ تو اس بہانے کچھ زیادہ ہی کھل کھیلتا ہے۔ تنہائی میں بسر کرنے والے بھی اس سے درغلائے جاسکتے ہیں۔ وہ اپنے کونوں کھدروں سے نکل کر محفلوں، مجمعوں میں جانے کی سوچنے لگتے ہیں تاکہ جسموں کے قرب سے گرمی حاصل ہو۔ حصول لذت کی یہی جستجو لوگوں کو مال پر کھینچ لائی تھی۔''

''اوورکوٹ'' کا ہیرو اس طبقے کا نمائندہ ہے جسے کھل کھیلنے اور داد عیش دینے کے مواقع حاصل نہیں ہیں لیکن جو بہرحال زندگی کی گہما گہمی، چہل پہل، چمیز چھاڑ اور لذت پرستی سے لطف اندوز ہونے کا خواہاں نظر آتا ہے۔ یہ افسانہ غربت کا رزمیہ ہے اور نہ مرثیہ بلکہ یہ ایک ایسا سفر ہے جس کا انجام تو المناک ہے لیکن اس انجام تک پہنچتے پہنچتے قاری ایسے موڑوں سے گھٹتا ہوا گزرتا ہے کہ چند لمحوں کے لیے ہی سہی لیکن زندگی کی مایوسیاں اور ناکامیاں خوشدلی اور رنگینی کا روپ دھار لیتی ہیں۔

نوجوان پہلے ایک پارک کی ایک خالی بنچ پر بیٹھتا ہے۔ جیب خالی ہونے

کے باوجود سگریٹ فروش لڑکے سے دس کا چینج مانگنا اور پھر نہ ملنے پر دل میں خوش ہوتا ہے اور اگلی کی سگریٹ خرید کر لطف اندوز ہوتا ہے۔ اس کا اگلا پڑاؤ انگریزی موسیقی کی ایک دوکان ہے جہاں سے وہ تازہ ریکارڈوں کی فہرست طلب کر کے کوٹ کی جیب میں اڑس لیتا ہے۔ دکان سے نکلنے کے بعد وہ پھر مٹر گشتی پر روانہ ہو جاتا ہے۔ دریں اثنا اس کے قریب سے ایک نوجوان جوڑا گزرتا ہے۔ اس جوڑے میں اسے ایک عجیب لیکن مانوس سی کشش اور جاذبیت محسوس ہوتی ہے۔ اس کا سبب شاید یہ ہو کہ خود اسے عورت کا ایسا قرب کبھی حاصل نہیں ہوا تھا۔ وہ ان کے پیچھے پیچھے چلنے لگتا ہے۔ ان کی بات چیت سے نوجوان پر یہ راز منکشف ہوتا ہے کہ وہ دونوں غیر شادی شدہ ''پریمی'' ہیں۔ لڑکی حاملہ ہو چکی ہے۔ لڑکا اسے حمل ضائع کرنے کے لیے ورغلاتا ہے لیکن لڑکی کے اندر رچا بسا ہوا مامتا کا جذبہ اسے ایسا کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔ وہ نوجوان کی بات ماننے سے صاف انکار کر دیتی ہے۔

واضح رہے کہ ''اوور کوٹ'' آزادی سے پہلے اس خالص روایتی مشرقی معاشرے میں لکھا جانے والا افسانہ ہے جب ہمارے یہاں تو کیا مغرب میں بھی جنسی بے راہ روی کی آزادی (Permissiveness) کا وہ تصور موجود نہیں تھا جو آج نظر آتا ہے۔

نوجوان اس جوڑے کی گفتگو میں کچھ اس درجہ محو ہو جاتا ہے کہ اسے سامنے سے آتے ہوئے تیز رفتار ٹرک کا احساس تک نہیں ہوتا۔ زخمی حالت میں جب وہ اسپتال پہنچایا جاتا ہے اور آپریشن روم میں اس کے کپڑے اتارے جاتے ہیں تو نرسوں اور ڈاکٹروں کو پتہ چلتا ہے کہ ''نوجوان کے گلوبند کے نیچے کھلائی اور کالر تو کیا سرے سے قمیص ہی نہیں تھی۔ ایک بوسیدہ سوئٹر جو وہ پہنے ہوئے تھا اس میں جگہ جگہ سوراخ تھے۔ اس کی جرابیں نہ صرف پھٹی ہوئی تھیں بلکہ ایک پاؤں کی جراب دوسرے پاؤں کی جراب سے مختلف تھی۔'' اس کے کوٹ کی جیب سے جو چیزیں برآمد ہوئیں وہ یہ تھیں۔

''ایک چھوٹی سی کنگھی، ایک رومال، ساڑھے چھ آنے، ایک بجھا ہوا آدھا سگریٹ، ایک چھوٹی سی ڈائری جس میں مختلف لوگوں کے پتے لکھے ہوئے تھے، نئے گراموفون ریکارڈوں کی ماہانہ فہرست۔ افسوس کہ اس کی بید کی چھڑی جو حادثے کے دوران کہیں کھو گئی تھی اس فہرست میں شامل نہ تھی۔''

جیسا کہ آپ نے دیکھا لباس اور موسیقی سے لگاؤ کی حد تک تو غلام عباس نے اس نوجوان کو کسی حد تک خود سے شناخت کرنے کی کوشش کی ہے۔ باقی جو کچھ بھی ہے افسانوی تخیل کی ایجاد ہے۔ لیکن پورے افسانے میں قاری کو کہیں بھی یہ محسوس نہیں ہونے پاتا کہ وہ حقیقت کے بجائے افسانے سے دوچار ہے۔ غلام عباس کا انسانیت پرست تخیل ہمیں متذکرہ بالا ماحول کا حصہ بنا دیتا ہے۔ افسانہ نگار کے معاشرتی مشاہدات ہمارے اپنے تجربات میں ڈھل جاتے ہیں۔ نوجوان کا انجام یقیناً المناک ہے۔ لیکن ایسا لگتا ہے کہ نوجوان میں اپنے آپ کو بہلانے اور خوش رکھنے کی جو خواہش تھی وہ اپنے منطقی انجام کو پہنچ چکی ہے۔ ایک لمحے کے لیے بھی قاری کو یہ احساس نہیں ہوتا کہ افسانہ نگار نے محض افسانے کو ختم کرنے کے لیے مرکزی کردار کو مار ڈالا ہے۔

پطرس بخاری نے غلام عباس کے کرداروں سے بحث کرتے ہوئے ایک جگہ بڑے پتے کی بات کہی ہے۔

''ان کے کیریکٹر بڑے بے بضاعت لوگ ہوتے ہیں جنھیں راہ چلتے میں شاید آپ نظر اٹھا کر بھی نہ دیکھیں۔ غلام عباس کو ان کی تنگ و تاریک زندگی میں طرح طرح کی دلچسپیاں نظر آتی ہیں اور ان کی صحبت میں انھیں ایک محققانہ لطف حاصل ہوتا ہے۔ وہ ان کی حقیر آرزوؤں کو بھی سمجھتے ہیں، ان کی کمزوریوں اور فریب کاریوں کو بھی جانتے ہیں لیکن ان پر برہم نہیں ہوتے، صرف مسکرا دیتے ہیں۔''

جیسا کہ ہم سب جانتے ہیں کرداروں کی تشکیل، ان کے ارتقا اور ان کی پیش کش کا سارا معاملہ براہ راست افسانوی تکنیک کا حصہ ہوتا ہے۔ موضوعات کے انتخاب کا تعلق بھی اسی تکنیک سے ہوتا ہے۔ کرداروں کے سلسلے میں غلام عباس نے وہ رویہ اختیار نہیں کیا جو ہمیں ان کے اہم ترین ہم عصروں یعنی منٹو، بیدی، کرشن اور عصمت وغیرہ کے یہاں نظر آتا ہے۔ منٹو وغیرہ کے بیشتر افسانوں میں ہم واضح طور سے نشان دہی کر سکتے ہیں کہ افسانہ نگار کی ہمدردیاں کس کردار کے ساتھ ہیں اور کس کے ساتھ نہیں۔ اتنا ہی نہیں ہمیں تو یہاں تک کہنے کو تیار ہوں کہ بیدی، منٹو اور کرشن نے اپنے اپنے کرداروں میں اپنے جذباتی رہنما تلاش کر لیے تھے۔ اس سلسلے میں غلام عباس کا رویہ قطعاً مختلف ہے۔

ان کے کرداروں میں خواہ ان معنی میں گہرائی اور پیچیدگی نہ ملتی ہو کہ ہر کردار کی علامتی تشریح و تفہیم کی جا سکے یا پھر ان کے کردار اس سماجی ثقافتی طمطراق کے حامل نہ ہوں جو قرۃ العین حیدر کے کرداروں کا وصف ہے لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ غلام عباس کے بیشتر کردار اپنے تمام معمولی پن کے باوجود افسانوی تناظر میں غیر معمولی ثابت ہوتے ہیں۔ ان کا کوئی بھی کردار خواہ بظاہر کتنا ہی چھوٹا اور معمولی نظر آئے ان کے مجموعی افسانوی فریم ورک کے اعتبار سے بیکار یا فالتو نہیں ہوتا۔ کسی نہ کسی سطح پر اس کا افسانوی ارتباط بہر حال قائم رہتا ہے۔

اردو افسانے کے قارئین کو پریم چند کے زمانے سے ہی مثالی کرداروں کی عادت پڑ گئی تھی۔ کرشن چندر اور منٹو کے یہاں بھی مثالی کردار وافر تعداد میں نظر آتے ہیں۔ غلام عباس کے کردار اگر مثالی نہیں تو اس کا سبب یہ ہے کہ انھوں

نے جان بوجھ کر اپنے لیے عموماً بجھ معمولی طبقوں سے تعلق رکھنے والے کرداروں کے انفرادی ڈائلما اور ان کے انفرادی مسائل کو منتخب کیا ہے۔ دراصل غلام عباس اس راز کو پا گئے تھے کہ کسی ایک عہد کے مخصوص سیاسی اور سماجی مسائل آنے والے زمانوں میں نہ صرف اپنا ارتباط کھو دیتے ہیں بلکہ ایک حقیقی فنکار کی حیثیت سے وہ یہ بھی جانتے تھے کہ نئے زمانے کے نئے لوگ بسا اوقات عہد گذشتہ کے سیاسی و معاشرتی مسائل کو یکسر فراموش کر دیتے ہیں۔

اس صورت حال کے برخلاف انسانی جبلتوں اور جذبات و احساسات کی عمومی اہمیت بہرطور برقرار رہتی ہے۔ انفرادی انسانی کرداروں کے رنگ کبھی پھیکے نہیں پڑتے۔ اس حد تک کہ بسا اوقات سماجی اور اخلاقی بحران بھی انھیں تبدیل کرنے سے قاصر رہتا ہے۔ ''سیاہ و سفید'' کی میمونہ ''کن رس'' کا فیاض ''بھنور'' کے حاجی شفاعت احمد ''سایہ'' کا سبحان ''اس کی بیوی'' کا بے نام نوجوان ہیرو ''غازی مرد'' کی چراغ بی بی اور ''برہ فروش'' کی جمی ایسے ہی کردار ہیں جو متعلقہ افسانوں کے موضوع اور پلاٹ سے قطع نظر بھی قاری کا ساتھ نہیں چھوڑتے بلکہ برابر اس کا پیچھا کرتے رہتے ہیں۔

غلام عباس کے بیشتر افسانوں میں جو غیر معمولی داخلیت پائی جاتی ہے وہ ایسے ہی کرداروں کے توسط سے آئی ہے۔ بحیثیت افسانہ نگار وہ جس طرح ایک کردار سے دوسرے کردار تک سفر کرتے ہیں اور اس سفر میں وہ جس طرح قاری کو نہ صرف اپنے ساتھ بلکہ دو ایک قدم آگے رکھتے ہیں وہ چیز ان کے افسانوں کو خود بخود زیادہ موثر بنا دیتی ہے۔ ان کے افسانوں کی کامیابی کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ وہ کرداروں کی خارجی زندگی کا استعمال محض داخلی پہلوؤں کو ابھارنے اور اجاگر کرنے کے مقصد سے کرتے ہیں۔ اسی لیے ان کے افسانوں میں موجود آخری تفصیل تک قاری پر کوئی نہ کوئی اثر ضرور مرتسم کرتی ہے۔

حالات اور واقعات کے رخ وقت اور آگے بڑھتے ہوئے زمانے کے ساتھ بدلتے رہتے ہیں۔ لیکن احساسات و جذبات اور انسانی جبلتوں کا ارتباط ہر زمانے میں یکساں طور سے قائم رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ غلام عباس کے وہ افسانے جنھیں لکھے ہوئے کافی سے زیادہ عرصہ ہو چکا ہے ہمیں اپنی موجودہ زندگی سے مربوط نظر آتے ہیں۔ غلام عباس ایک بڑے افسانہ نگار ہی نہیں ایک بڑے فنکار بھی تھے۔ افسانہ نگاری تو افسانہ نگار کے ساتھ ختم ہو جاتی ہے، فنکاری کا تناظر ہر دور میں بدل جاتا ہے لیکن اس کی تازگی اور شادابی میں فرق نہیں آتا۔ چنانچہ غلام عباس کے افسانے آج بھی ہمیشہ کی طرح تازہ اور شاداب نظر آتے ہیں۔

□□□

عبدالحلیم شرر — بحیثیت ناول نگار

مصنف: علی احمد فاطمی

اس کتاب میں مصنف نے عبدالحلیم شرر کے ناولوں کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ پیش کیا ہے۔ موصوف نے شرر سے قبل کی سیاسی، سماجی اور ادبی صورت حال کے جائزے میں شرر کے حالات زندگی، خاندانی پس منظر، ملازمتوں اور علمی مشاغل، سفر انگلستان اور قیام حیدرآباد نیز ان کی بعض اہم تحریروں کی اولین اشاعت جیسے امور سے تفصیلی بحث کی ہے۔

صفحات: 393، قیمت -/165 روپے

غزل اور غزل کی تعلیم

مصنف: اختر انصاری

اختر انصاری کی یہ کتاب غزل کی تعلیم کے دوران پیش آنے والے مسائل سے بحث کرتی ہے جس میں اردو غزل کے تاریخی و ادبی پس منظر پر روشنی ڈالتے ہوئے اردو غزل کی ہیئت و مقبولیت، اس کے فنی محاسن، غزل کی تنقید اور بتدریج ارتقائی سفر کا احاطہ کیا گیا ہے۔ یہ کتاب بہ طور خاص درس و تدریس سے وابستہ افراد کے لیے اہمیت کی حامل ہے۔

صفحات: 231، قیمت -/66 روپے

خواجہ دل محمد

(ہماری مطبوعات سے)

گیتا اور اس کی تعلیم

''شریمد بھگوت گیتا'' دنیا کی قدیم روحانی کتابوں میں بے نظیر اہمیت رکھتی ہے۔ اس کا مضمون شری کرشن جی مہاراج کا وہ اپدیش ہے جو انھوں نے ارجن کو کوروکشیتر کے میدان میں مہابھارت کی جنگ کے وقت دیا۔ جس میں انھوں نے بتایا ہے، انسان کیا ہے، روح کیا ہے، خدا کیا ہے، بھگتی اور وصالِ باری کیوں کر حاصل ہو سکتے ہیں، انسان کے فرائض کیا ہیں، نشکام کرم یعنی بے لوث عمل کا کیا درجہ ہے۔ یہ عرفانی مضمون سنسکرت کے سات سو شلوکوں میں بیان کیا گیا ہے۔ ہر شلوک معرفت کا رنگین پھول ہے۔ انھی سات سو پھولوں کی مالا کا نام ''گیتا'' ہے۔

یہ مالا کروڑوں انسانوں کے ہاتھوں میں پہنچ چکی ہے لیکن تا حال اس کی تازگی، اس کی نفاست، اس کی خوشبو میں کوئی فرق نہیں آیا۔ یہ پھول اس باغ سے چنے گئے ہیں، جس کا نام گلشنِ بقا ہے، جسے آبِ حیات نے سینچا ہے اور جس پر حُسن کی اُس ملکہ کا راج ہے، جس کا نام حقیقت ہے۔

اس پھول مالا میں عجب خوشبو ہے اور اس خوشبو میں عجب تاثیر۔ اس مالا کو پہنو تو دل و دماغ پر لاہوتی تاثرات چھا جاتے ہیں اور کائنات کے ذرّے ذرّے میں آفتاب جھلکنے لگ جاتے ہیں۔ ہر خار پھول بن جاتا ہے اور ہر پھول فردوسِ نگاہ، عالم تمام تجلّی گاہِ ربانی نظر آنے لگتا ہے۔ جسم کا تودۂ خاکی نور کی مورت بن جاتا ہے۔ دل پر ایک روحانی سکون چھا جاتا ہے اور اس پھول مالا کی ہر پتی کتابِ عرفان کا ورق بن جاتی ہے۔

پرماتما (خدا): سب سے پہلا اور سب سے اہم سوال خدا کی ہستی کا ہے۔ کیا خدا ہے؟

گیتا جواب دیتی ہے ''خدا ہے'' بلکہ ''خدا ہی ہے'' دوسرے لفظوں میں گیتا وحدتِ وجودی کی قائل ہے۔

فطرت کہو، نیچر کہو، پرکرتی کہو، مایا کہو، غرض یہ کہ عالم میں جو کچھ نظر آ رہا ہے، خدا ہی کا ظہور ہے۔ سورج کے جلال میں اسی کی تابانی ہے، چاند کے جوبن میں اسی کی دلفریبی، سرو و چنار میں اسی کی رعنائی، پھولوں میں اسی کی نفاست، سمندر میں اسی کی بے پایانی، آسمان میں اسی کی بلندی اور زمین میں اسی کا حلم کارفرما ہے۔ یعنی ''جدھر دیکھتا ہوں ادھر تو ہی تو ہے'' کا عالم ہے۔ اسی کو حق پہنچتا ہے کہ کہے:

یہ سورج کی تابش مرا نور ہے
جہاں جس کے جلووں سے معمور ہے
جو ہر سمت پاتا ہے میرا ہی نور
مجھی میں جو ہر شے کا دیکھے ظہور
کبھی مجھ سے منہ موڑ سکتا نہیں
کبھی میں اسے چھوڑ سکتا نہیں

عالم کا ذرّہ ذرّہ اسی سے وابستہ ہے۔ اگر وہ نہ ہو تو یہ شیرازہ منتشر ہو جائے:

سن اَرجُن نہیں کچھ بھی میرے سوا
نہ ہے مجھ سے بڑھ کر کوئی دوسرا
پرویا ہے سب کچھ مرے تار میں
کہ ہیرے ہوں جیسے کسی ہار میں

سانکھیہ فلاسفی کے مطابق دنیا کی ہر چیز دو مختلف خود مختار ابدی عناصر سے پیدا ہوئی ہے۔ (1) بے جان پرکرتی (مادّہ) سے (2) جاندار پرش (روح) سے۔ لیکن گیتا وحدانیت کی قائل ہے، اس کے مطابق مادّہ اور روح دونوں ایک ہی پرمیشور کا ظہور ہیں۔ مادّے کو خدا کی اپرا پرکرتی (ادنیٰ فطرت) سمجھو اور روح کو پرا پرکرتی (اعلیٰ فطرت) دنیا کی ہر چیز انھی دونوں سے پرمیشور کی نگرانی میں پیدا ہوتی ہے۔ اپرا پرکرتی (ادنیٰ فطرت) کے عناصر آٹھ ہیں:

یہ مٹّی، یہ پانی، یہ آگ اور ہوا
یہ آکاش دنیا پہ چھایا ہوا
یہ دانش، یہ دل، یہ خیالِ خودی
ہے ان آٹھ حصوں میں فطرت مری
یہ فطرت تو ادنیٰ ہے سُن او قوی
مگر میری فطرت ہے اِک اور بھی

''دل کی گیتا'' سے ماخوذ، مصنف: خواجہ دل محمد/صفحات 240، قیمت: -/92 روپئے
نوٹ: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی جانب سے طلبہ اور اساتذہ کے لیے بالترتیب 45% اور 40% کی خصوصی رعایت دی جاتی ہے۔ تاجران کتب کو قومی اردو کونسل کے ضوابط کے مطابق رعایت دستیاب ہے۔ ادارہ

وہ فطرت ہے عالی ہے جو حیات
اسی سے تو قائم ہے کُل کائنات

یہ اعلیٰ فطرت روحانی فطرت ہے، یہی منبعِ زندگی ہے، یہی جیو آتما کی شکل میں نباتات، حیوانات سب میں پائی جاتی ہے۔ صرف پرکرتی اور پُرش ہی خدا کا مظہر نہیں بلکہ ان کے تمام صفات بھی خدا ہی کا مظہر ہیں:

میں پانی میں رس، چاند سورج میں نور
میں ہوں اوم، ویدوں میں جس کا ظہور
صدا مجھ کو آکاش میں کر خیال
میں مردوں میں مردی ہوں کنتی کے لال

لیکن اس ادنیٰ فطرت (پرکرتی) اور اعلیٰ فطرت (پُرش) سے بلند تر خود پرماتما کی ذاتِ پاک ہے جو انسانی تخیل سے بالا، جستجو کی رسائی سے بلند، ظاہر سے مستور اور باطن سے بھی دور ہے:

پرے غیب سے بھی ہے اک ذاتِ غیب
وہ ہستی، فنا کا نہیں جس میں عیب
کسی کی نہ کچھ بات باقی رہے
فقط اک وہی ذات باقی رہے
اسی کو بقا ہے اسی کو ثبات
جہاں پر ہے چھائی ہوئی جس کی ذات
بھلا کس کی طاقت ہے، کس کی مجال
فنا کر سکے، ہستیِ لازوال

وہ ذاتِ بالا و برتر، ہر ابتدا کی ابتدا اور ہر انتہا کی انتہا ہے۔ سَت اور اَست یعنی حق و باطل یا باقی وفانی دونوں سے بالا ہے۔ وہی محض اس قابل ہے کہ اس کو جانا جائے۔ اسی کے علم کا نام امرت اور آبِ حیات ہے:

سزاوارِ عرفاں ہے وہ پاک ذات
کہ ہے علم ہی اُس کا آبِ حیات
وہ ہے ابتدا، لم یزل، ذی حشم
نہ سَت یا اَست کہہ سکیں جس کو ہم

خدا ہر چیز پر محیط ہے کوئی چیز اُس سے باہر نہیں:

ہوا گو چلے زور سے سر بسر
اِدھر سے اُدھر یا اُدھر سے اِدھر
وہ آکاش سے جائے باہر کہاں
سمجھ لو یونہی میرے اندر جہاں

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر خدا ہر چیز میں موجود ہے تو کیا وہ قابلِ تقسیم ہے؟ گیتا کا جواب ہے نہیں، ہرگز نہیں۔ اس کی تقسیم محال ہے:

محال اُس کی تقسیم اے ذی شعور
مگر اُس کا ہر شے میں حصہ ضرور
سزاوارِ عرفاں وہ پروردگار
فنا و بقا کا اُسی پر مدار

دنیا میں جو کچھ ہے اور ہوگا اس کی اصل اور بیج پرماتما ہے:

کروں خلقِ عالم کی ترویج میں
ہوں ارجن ہر اِک چیز کا بیج میں
ہے ساکن کوئی یا کہ سیّار ہے
مگر مجھ سے باہر نہ زنہار ہے

اگر ہر طرف وحدتِ وجودی کا ظہور ہے، تو پھر یہ کثرت کیسی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اصل ہر شے کی ایک ہے۔ صرف نام اور روپ یعنی صورتِ ظاہری کا فرق ہے۔ کمہار کے پاس وہی مٹی ہوتی ہے۔ کہیں اس سے پیالہ بناتا ہے، کہیں صراحی، کہیں مٹکا، کہیں رکابی، کہیں ہنڈیا۔ غور کرو تو سب کی اصل وہی ایک مٹی ہے، نام اور روپ کا فرق ہے، اسی کا نام مایا ہے۔ اسی کو فریبِ نظر، سموہ، جہالت، اگیان، جو چاہو کہو۔ اَرجُن سے ارشاد ہوتا ہے:

سُن اَرجُن خدا ہے خدا ہر کہیں
خدائی کے دل میں خدا ہے مکیں
وہ سب ہستیوں کو گھماتا رہے
وہ مایا کا چکّر چلاتا رہے

پھر ارشاد ہوتا ہے:

مری ذات ہے مالکِ کائنات
نہ اس کو ولادت نہ اس کو ممات

خدا کی ثنا میں چند شلوک ملاحظہ ہوں:

ہے باقی و فانی سے بالا وہ حق
کہ قائم ہوئے جس سے تینوں طبق
وہ ہے لافنا، سب پہ چھایا ہوا
وہ پرمیشور ہے، وہ پرماتما
وہی ذات نورِ علیٰ نور ہے
جو تاریکیوں سے بہت دور ہے
ہے سب جان والوں میں جانی وہی
کہ فانی میں ہے غیر فانی وہی
کسی شے میں جنبش، کسی میں سکوں
وہ موجود سب میں درون و بروں

یہ روحانی گیت جس کا نام "شریمد بھگوت گیتا" ہے، ایسے ہی بلند

خیالات سے معمور ہے۔ ہاں اتنا یاد رہے کہ اگر فطرتِ یزدانی کی مندرجہ بالا سہ گونہ نوعیت کو مدِ نظر نہ رکھیں گے تو خیالات میں الجھن پیدا ہونے کا احتمال ہے۔ کسی شلوک میں ادنیٰ فطرت (اپراپرکرتی) کی طرف اشارہ ہے تو کسی میں عالی فطرت (پراپرکرتی) کی طرف اور کسی میں ہر دو سے بالا ذاتِ باری (پرماتما) کا ذکر ہے جو صفات سے بالا (نرگن) ہے۔ اسی لیے اس نازک مضمون کو سوچ کر پڑھنے کی ضرورت ہے اور پڑھنے سے زیادہ اس پر غور کرنے کی۔

آتما (روح): پرماتما (خدا) کے صحیح تصور کے بعد خود انسان کا صحیح تصور ہونا بھی ضروری ہے، جس طرح پرماتما کی فطرت کو تین رنگوں میں دیکھ چکے ہو یعنی اپراپرکرتی (ادنیٰ فطرت) پراپرکرتی (اعلیٰ فطرت) اور پرمیشور، اسی طرح انسان کی فطرت کا حال ہے۔

(1) پنچکر کثیف یعنی تن، یہ انسان کی ادنیٰ فطرت ہے۔

(2) پنچکر لطیف یعنی حواس، من، عقل وغیرہ یہ اس کی اعلیٰ فطرت ہے۔

(3) آتما یعنی روح، یہ وہ اصل چیز ہے جس کا نام انسان ہے۔

تنِ فانی، ہر لحہ متغیر ہونے والا، بچپن میں کچھ، جوانی میں کچھ، بڑھاپے میں کچھ، اسی کو سب کچھ سمجھنا نادانی ہے۔

من، حواس، عقل وغیرہ لباس کی طرح ہیں جن میں آتما ملبوس ہے۔ یہ آتما کی طرح لازوال نہیں۔

آتما (روح) یہ قائم، دائم، باقی، بچپن میں بھی وہی، جوانی میں بھی وہی، بڑھاپے میں بھی وہی۔ بے تغیر، بسیط، یہی اصل چیز ہے۔ انسان نہ تن کا نام ہے نہ من کا، یہ اسی آتما (روح) کا نام ہے اور یہ روح لازوال ہے۔

شری کرشن ارجن سے فرماتے ہیں:

ازل سے تھی موجود ہستی مری
ازل سے تھی موجود ہستی تری
یہ راجے سبھی اور یہ خلقت تمام
ہمیشہ سے ہیں اور رہیں گے مدام
بسائے ہیں جس آتما نے وجود
وہ قائم ہے، دائم ہے اور بے حدود
ہے فانی بدن، آتما لازوال
پھر ارجن ہے کیوں جنگ میں قیل و قال

آتما (روح) پر حادثات کا کوئی اثر نہیں ہوتا:

کٹے گی نہ تلوار سے آتما
جلے گی کہاں نار سے آتما
جنم اس کو لینا نہ مرنا اسے
نہ آکر جہاں سے گزرنا اسے
انادی، ولادت، تغیر سے پاک
یہ مرتی نہیں گو بدن ہو ہلاک
تجھے آتما کا جو یہ گیان ہے
تو پھر کس لیے غم سے ہلکان ہے

تقابل: یہاں "گیتا" وہ نقطۂ نظر پیش کرتی ہے، جو اسلامی اور اکثر دیگر مذاہب کے نقطۂ نظر سے مختلف ہے:

بدلتا ہے انساں لباسِ کہن
نیا جامہ کرتا ہے پھر زیبِ تن
اسی طرح قالب بدلتی ہے روح
نئے بھیس میں پھر نکلتی ہے روح

پرکرتی (مادّی دنیا): جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے، فطرتِ ایزدی کا سب سے ادنیٰ مظہر مادّی دنیا ہے۔ اسی کو نیچر یا مایا کہتے ہیں۔ یہ تین عناصر سے مرتب ہے اور انھی کی ترکیب اور باہمی کش مکش پر عالم کی تمام نیرنگیوں کا دارومدار ہے۔ ان عناصر کے نام یہ ہیں:

(1) ستوگن
(2) رجوگن
(3) تموگن

ستوگن کو صفاتِ علوی سمجھو، ان کا رجوع بلندی اور ترقی کی طرف ہے، یہ صفات انسان کو نیکی اور خدا کی طرف لے جاتی ہیں۔

رجوگن کو صفاتِ جذباتی کہو، ان کا مقصد حرکت، جد وجہد اور کش مکش ہے، یہ صفات انسان کو کاروباری اور کامیاب دنیادار بناتی ہیں۔

تموگن کو صفاتِ سفلی کہو، یہ انسان کو گناہ اور پستی کی طرف لے جاتی ہیں۔

آتما جب تن کے پنجرے میں آتی ہے اور مایا کے پردے میں چھپ جاتی ہے تو یہی جیو آتما یا روح انسانی کہلاتی ہے۔ ان گنوں کا اثر جیو آتما کو پابند کرنا اور اُس کی آزادی میں خلل ڈالنا ہے۔

نمودار مایا سے ہوں تین گن
ستوگن رجوگن تموگن یہ سُن
جو ہے لافنا روح تن میں مکیں
یہ گن قید کرتے ہیں اُس کو وہیں
ستوگن کی فطرت ہے پاکیزہ نور
نہ عیب اس میں اَرجن نہ کوئی قصور
رجوگن کی فطرت ہے جذبات کی
ہے جینے کا شوق اس کو اور تشنگی

یہ ذوقِ عمل کا بناتی ہے جال
کرے رُوح کو قید کلتی کے لال
تموگن جہالت کی اولاد ہے
کب اس سے مکیں تن کا آزاد ہے
کرے قید دھوکے سے بھارت! اسے
کرے خواب و غفلت سے غارت! اسے

اس لیے انسان کا مقصد جیو آتما کو گنوں کی قید سے رہائی دلانا ہے۔ تموگن کی وجہ سے روح جہالت اور موہ کے جنجال میں پھنسی ہو تو رجوگن کی طرف ترقی کرے۔ رجوگن کے غلبے سے دنیوی کاروبار میں انہماک ہو تو ستوگن کی طرف بڑھے۔ ستوگن کی وجہ سے مسرّت اور ذوقِ دانش کا شوق ہو تو عرفانِ باری کی مدد لے کر اُس سے بھی پار نکل جائے اور واصل بحق ہونے کی کوشش کرے، کیونکہ آتما کا انتہائے کمال پرماتما سے وصال ہے، اسی کا نام موکش ہے اسی کا نجات:

بدن کا ہے تینوں گنوں پر مدار
مکینِ بدن گر، کرے اُن کو پار
وہ چکھتا ہے امرت، وہ پاتا ہے سُکھ
نہ جینا، نہ مرنا، نہ پیری، نہ دُکھ

نجات کے تین راستے: جب مادّی دنیا میں پھنسی ہوئی جیو آتما کا منتہائے نظر پرماتما سے جاملنا ہے تو دیکھنا چاہیے کہ اس منزلِ مقصود (یعنی نجات) تک پہنچنے کے لیے کون سے راستے اختیار کرنے چاہئیں۔ یہ راستے تین ہیں:

1. کرم مارگ (راہِ عمل)
2. بھکتی مارگ (راہِ عشق و محبت)
3. گیان مارگ (راہِ عرفان)

(1) کرم مارگ (راہِ عمل): ''گیتا'' کا مسلک یہ ہے کہ ہر عمل کی جزا ملنا لازمی ہے۔ انسان جو بھی کام کرتا ہے، اس کا اثر اس کے ذہنی اوصاف یا گنوں پر پڑتا ہے، مرنے پر یہ گنوں کا مجموعہ اس کی جیو آتما (روح) کے ہمراہ جاتا ہے اور اُسی کے مطابق اس کی روح کو بُری یا بھلی یونی میں جانا پڑتا ہے۔ اس کی روح جس قدر ارتقائی منازل طے کر چکی ہوگی، اسی قدر اعلیٰ یونی اس کو حاصل ہوگی۔ اس لیے نجات کے لیے اعمالِ صالح ضروری ہیں۔

بعض لوگ ترکِ عمل (سنیاس) کو راہِ نجات سمجھتے ہیں۔ ان کا خیال ہے نہ کرم ہوں گے نہ ان کی سزا و جزا کی وجہ سے تناسخ کے چکّر میں جانا پڑے گا، ''گیتا'' اس کو پسند نہیں کرتی:

کہ انساں کبھی ترکِ اعمال سے
رہا ہو نہ کرموں کے جنجال سے
فقط ترکِ اعمال سے ہے محال
کہ حاصل کسی کو ہو اوجِ کمال

عمل اور حرکت قانونِ فطرت ہے۔ مثلاً اگر دورانِ خون ہی بند ہو جائے تو انسان ایک پل زندہ نہیں رہ سکتا:

جہاں میں نہ دیکھو گے تم ایک پل
کہ کوئی بھی فارغ ہے او رہے عمل
سبھی کام کرنے پہ مامور ہیں
گنوں ہی سے فطرت کے مجبور ہیں
مجھے دیکھ! دنیا کا دینا ہے کچھ
نہ تینوں جہانوں سے لینا ہے کچھ
کمی کچھ نہیں گو مجھے زینہار
مگر پھر بھی رہتا ہوں مصروفِ کار

جب عمل کے بغیر چارہ نہیں تو پھر انسان کیسے اعمال کرے کہ سزا و جزا سے بچا رہے؟ اس کا جواب گیتا نے یہ دیا ہے کہ وہ نشکام کرم کرے یعنی (1) اپنے فرائض بجالائے (2) جو کام کرے خدا کے لیے کرے (3) کسی کام سے اجر و انعام کی توقع نہ رکھے اور نہ اسے اجر و انعام کے لالچ سے کرے یا دوسرے الفاظ میں بھگوت ارپن بُدھی سے سب کام کرے یعنی سب کام فی سبیل اللہ کرے۔ یہی سب سے اونچا ''گیتا'' کا نشکام کرم ہے۔

سب سے پہلے انسان کو چاہیے وہ فرائض ادا کرے جو اس کی اپنی ذات، اپنے اہل و عیال، اپنے سماج، اپنے وطن، بنی نوع انسان یا دیگر حیوانات سے متعلق ہیں، کیونکہ فرض کی تعمیل عینِ عبادت ہے:

جو ہے فرض تیرا کر اس پر عمل
کہ ترکِ عمل سے ہے بہتر عمل
عمل چھوڑ دینے ہوں تجھ کو تمام
تو مشکل ہے تیرے بدن کا قیام

2. ہر کام خدا کے لیے کرو۔ ہر کام کو یگیہ (قربانی) سمجھ کر کرو اور کسی کام سے پھل کی توقع نہ رکھو:

تجھے کام کرنا ہے او مردِ کار
نہیں اس کے پھل پر تجھے اختیار
کیے جا عمل اور نہ ڈھونڈ اس کا پھل
عمل کر عمل کر نہ ہو بے عمل

صحیح لائحۂ عمل یہ ہے کہ فاعلِ حقیقی خدا کو سمجھو، تم اسی کے ہاتھ ہو جو کام کر رہے ہو، تم اسی کی آنکھ ہو جو دیکھ رہے ہو، تم اسی کے کان ہو جو سن رہے ہو، تم

اسی کے پابند ہو جو چل رہے ہو، کام تمھارا نہیں کام خدا کا ہے، کام تم نہیں کر رہے، خدا کر رہا ہے، فطرت کر رہی ہے، فطرت کے تئیں کر رہے ہیں، تم اپنی مرضی کو خدا کی مرضی کے تابع کر دو، جو کام وہ تم سے کرا رہا ہے کیے جاؤ۔

اگر تم خود کو فاعل سمجھتے ہو تو تم غلطی پر ہو۔ تمھارے دل میں خودی ہے۔ تمھاری عقل جہالت میں پھنسی ہے:

یہ دنیا کی رونق، یہ کاموں کی دُھن
سبب اس کا اصلی، ہیں فطرت کے تئیں
مگر جس کے دل میں انہنکار ہے
سمجھتا ہے خود کو کہ مختار ہے

کام کرو لیکن خدا کا کام سمجھ کر، اپنی ذات کو بے تعلق کر کے، جیسے کنول کا پتہ پانی میں رہ کر بھی خشک رہتا ہے:

رہے بے تعلق، کرے جب عمل
خدا ہی کی خاطر کرے سب عمل
خطا سے ہمیشہ رہے گا بری
کنول کے نہ پتے پہ ٹھہرے تری

ایثار اور قربانی فطرت کا قانون ہے، پتھر پس پس کر خاک ہو جاتے ہیں، تاکہ نباتات کی خوراک بن سکیں، نباتات حیوانات کی خوراک بنتے ہیں، حیوانات حیوانات کی، اسی قانون کے تحت میں انسان کو انسان کے لیے ایثار اور قربانی سے دریغ نہ کرنا چاہیے، یہ ہے ترکِ عمل، یہ ہے سنیاس:

فقط میری خاطر تو ہر کام کر
ہَون وان دے سب مرے نام پر
ترا کھانا پینا ہو میرے لیے
ترا تپ سے جینا ہو میرے لیے
جو تو پاک دل ہو کے سنیاس پائے
تو آزاد ہو کر میرے پاس آئے

پس انسان کو دنیا میں نائب الٰہی ہو کر رہنا چاہیے۔ اس پر لازم ہے کہ جو کام کرے خدا کے لیے کرے، خودی سے دور رہے، خود کو خدا کی طرف سے مامور سمجھے اور کوئی کام محض دنیوی فائدے کو مدِ نظر رکھ کر اور ہوا و ہوس (لابھ) کی خاطر نہ کرے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اس کے دل کو چین اور من کو شانتی حاصل ہوگی، اور وہ وصالِ ذاتِ باری حاصل کر سکے گا۔

یگیہ، تپ اور دان: دل کی اس ستوگنی کیفیت کے ساتھ ہی یگیہ (نذر و نیاز) بکار آمد ہو سکتے ہیں، ورنہ محض بیکار ہیں:

وہی ہے ستوگن کا یگ باثمر ور
نہ ہو پھل کی خواہش کا جس میں فتور

عمل شاستر کی رعایت سے ہو
عبادت عبادت کی نیت سے ہو

اس طرح تپ (ریاضت) میں ریاکاری اور ظاہرداری مفید نہیں:

ریاضت دکھاوے کی گر جی کو بھائے
کہ لوگوں میں عزت ہو، پوجا کرائے
ریاضت وہ چنچل ہے نا پائدار
کر اس کو رجوگن ریاضت شمار

سخاوت وہی اچھی ہے جو بے دلی سے نہ کی جائے، جس سے بدلے کی توقع نہ ہو، جو مستحق لوگوں کو دی جائے، اور جن کو دان دیا جائے، ان کو ذلیل نہ سمجھا جائے:

ہو احساں سے بدلے کی خواہش اگر
سخاوت میں پھل پر لگی ہو نظر
اگر بے دلی سے کوئی دان دے
رجوگن سخاوت اسے جان لے

اس پاکیزہ اخلاق کی تعلیم کے لیے 17ویں اور 18ویں ادھیائے خاص طور پر ملاحظہ ہوں۔

(2) بھگتی مارگ (راہِ عشق و محبت): راہِ عشق و محبت میں پہلا قدم اپنے من پر قابو پانا یعنی ہوا و ہوس کو چھوڑ دینا ہے محسوسات کی محبت اور ان سے لگاؤ دور کر کے تمام تر توجہ پرماتما کے دھیان میں لگا دینے سے بھگتی حاصل ہو سکتی ہے:

ذرا سا بھی دے کوئی کچھوے کو چھیڑ
تو لیتا ہے فوراً سب اعضا سکیڑ
سکیڑے جو ہر شے سے اپنے حواس
وہ ہے قائم العقل اے حق شناس

فانی کی محبت کا نتیجہ جدائی ہے، جو سکھ اس سے حاصل ہوتا ہے اس کا نتیجہ دُکھ ہے:

تعلق سے پیدا جو ہوتا ہے سکھ
اسی سے نمایاں ہو آخر میں دُکھ
جو سکھ کا بھی آغاز و انجام ہے
تو دانا کہاں اس سے خوش کام ہے

لیکن محسوسات سے بے تعلقی کا یہ مطلب نہ ہو کہ لذاتِ دنیوی سے بظاہر الگ رہے مگر دل میں ان کی تمنا رکھے:

کرے نعمتیں ترک پرہیزگار
مگر شوقِ لذت سے ہو بے قرار

اسے ترکِ لذت کی لذت ملے
جسے دیدِ باری کی دولت ملے

جب انسان کی محبت کا مرکز ذاتِ باری تعالیٰ ہو جائے تو ماسوا کی الفت دل سے دور ہو جاتی ہے۔ جہاں باقی سے عشق ہو وہاں فانی کے لیے جگہ نہیں رہتی۔ اسی کا نام تیاگ ہے۔ اسی کا نام ترکِ دنیا:

جما دھیان مجھ میں، ہو مجھ پر فدا
تو کر یگ تو میرے لیے سر جھکا
اگر یوگ میں دل لگائے گا تو
میں مقصود ہوں، مجھ کو پائے گا تو

یہ مقامِ عبادت ہے۔ دلی خلوص اور سچی محبت سے انسان خدا تعالیٰ کی پرستش کرے کیونکہ اصل عبادت یہی ہے:

لگا مجھ میں دل بھگت ہو جا مرا
تو کر یگ، مرے سامنے سر جھکا
مجھے تجھ سے، مجھ سے تجھے پیار ہے
مرا وصل کا تجھ سے اقرار ہے

عبادت کے لیے سب راہیں کھلی ہیں، جو طریق تم کو پسند ہے، اسی طریق سے عبادت کرو، یہاں تو خلوص کی ضرورت ہے رسوم کی نہیں۔ تمام مذاہب کی منزل ایک ہی ہے یعنی قربِ باری تعالیٰ، اس لیے کسی ایک راہ کی قید نہیں:

مرے پاس جس راہ سے لوگ آئیں
میں راضی ہوں اُرجُن مُراد اپنی پائیں
اُدھر سے چلیں یا اِدھر سے چلیں
مرے سب ہیں رستے جدھر سے چلیں

بت پرستی: بے سمجھ آدمی صرف میرے مظاہر کی پوجا کرتے ہیں۔ کوئی دیوتاؤں کو پوجتا ہے، کوئی بھوتوں کو۔ لیکن عارف لوگ خاص میری ذات بے نشاں کی عبادت کرتے ہیں، جو جس کی پوجا کرے گا اسی تک پہنچے گا، جو میرا بھگت ہوگا، مجھ سے واصل ہوگا:

منائیں جو پتروں کو پتروں تک آئیں
جو بھوتوں کو پوجیں وہ بھوتوں کو پائیں
صنم کے پجاری صنم سے ملیں
ہمارے پرستار ہم سے ملیں

بھگتی کے لیے ذات پات کی کوئی قید نہیں، یہ ضروری نہیں کہ صرف برہمن یا پنڈت یا کشتری ہی عبادت کر سکتے ہیں بلکہ ویش ہو، شودر ہو، عورت ہو، خدا کی راہ سب پر کھلی ہے:

کوئی آدمی گرچہ بدکار ہے
مگر میرا دل سے پرستار ہے
اسے بھی سمجھ لے کہ سادھو ہے وہ
ارادے میں نیکی کے یکسو ہے وہ
وہ دھرماتما جلد ہو جائے گا
قرار و سکوں دائمی پائے گا
سمجھ دل سے یہ بات کنتی کے لال
مرا بھگت پائے نہ ہرگز زوال
بشر، پاپ کے پیٹ سے ہو کوئی
وہ ہو شودر یا ویش یا استری
مجھے آسرا جب بنائے گا وہ
تو اعلیٰ منازل پہ جائے گا وہ

(3) گیان مارگ (راہِ عرفان): انسانوں کی فطرت مختلف ہوتی ہے، بعض میں جوشِ عمل کا غلبہ ہوتا ہے، ان کے لیے خدا تک پہنچنے کا بہترین رستہ کرم یوگ ہے، وہ نشکام کام کریں یعنی بے لوث اور بغیر لالچ کے ہر کام کو خدا کا کام سمجھ کر کریں، یہی ان کے لیے راہِ نجات ہے۔

بعض انسانوں میں فطرتاً عشق و محبت کا ولولہ ہوتا ہے، ان کی طبیعت جذباتی ہوتی ہے، ان کے لیے بھگتی یوگ اور خالص عبادت ہی راہِ نجات ہے۔

گیان سے مراد ہے معرفتِ الٰہی، ایسے لوگوں کے لیے یہی بہتر ہے کہ وہ حقیقتِ ذاتِ باری پر غور کریں، پرماتما اور آتما کے راز کو سمجھیں، دنیا و مافیہا کی کثرت میں وحدت کی تلاش کریں، یہی ان کو معراجِ کمال تک پہنچانے کے لیے کافی ہوگا:

جسے آئے کثرت میں وحدت نظر
کہ ہر رنگ میں ہے وہی جلوہ گر
جو وحدت سے کثرت کا سمجھے ظہور
خدا سے ہو واصل وہی بالضرور

ایسے گیانی (عارف) پر تناسخ کا کوئی اثر نہیں:

اگر آتما کو کوئی جان لے
گنوں اور مایا کو پہچان لے
رہے جیسے چاہے وہ جس حال میں
نہ آئے تناسخ کے جنجال میں

مساوات: گیانی کو جب عرفانِ باری حاصل ہو جاتا ہے تو اسے ہر طرف ایک ہی پرماتما کا ظہور نظر آتا ہے، اسی لیے وہ سب جانداروں کی مساوات کا

قائل ہوتا ہے۔ برہمن اور چنڈال کو ایک جیسا سمجھتا ہے، سب کے دُکھ سکھ میں شریک ہوتا ہے، اس کا دل ہمدردی کا سرچشمہ اور رحمت کا منبع ہوجاتا ہے:

جو گیانی ہے یکساں نظر اس کو آئے
وہ ہو کوئی کتّا کہ ہاتھی کہ گائے
کوئی برہمن، عالم و بردبار
کہ چنڈال، ناپاک، مردار خوار
سکھ اوروں کا سمجھے جو اپنا ہی سکھ
دکھ اوروں کا سمجھے جو اپنا ہی دکھ
جو سب کو کرے اپنے جیسا خیال
سن اَرجن کہ یوگی ہے وہ باکمال

گیان (عرفان) حاصل کرنے سے انسان کے اعمال نرالے رنگ کے ہوجاتے ہیں، وہ سرتا پا چشمۂ رحمت بن جاتا ہے اور اس کے ذریعے سے خدائی فیضان تمام مخلوق کو پہنچنے لگتا ہے، اعمال کی سزا و جزا کا اس پر اثر نہیں ہوتا، دوسرے لفظوں میں اس کے تمام اعمال جل جاتے ہیں:

سُن اَرجن جو انبار خاشاک ہے
لگے آگ اس میں تو سب خاک ہے
یونہی گیان اگنی سے جاتے ہیں جل
بُرے ہوں عمل یا بھلے ہوں عمل

اس کی وجہ یہ ہے:

جو اَرجن ملے گیان، اُلجھن ہو دُور
تو ہو اس حقیقت کا تجھ پر ظہور
کہ سارا جہاں ہے تری ذات میں
تری ذات یعنی مری ذات میں

عارف کو کیا اجر ملتا ہے یہ بھی ملاحظہ ہو:

جو انساں کرے خواہشیں دل سے دُور
ہوس کا نہ ہو جس کے دل میں فتور
نہ اس میں خودی ہو، نہ ہو میر تیر
سکوں اس کو حاصل ہے، دل اس کا سیر
یہی ہے مقامِ وصالِ خدا
جہاں آکے ہوں سب تو ہم فنا
دمِ واپسیں بھی جو یہ گیان ہو
تو حاصل اُسے برہم نروان ہو

فوق البشر انسان (Super man): آخر میں ہم چند شلوک ایسے درج کرتے ہیں، جن سے معلوم ہوگا کہ "گیتا"، کس قسم کے فوق البشر انسان پیدا کرنا چاہتی ہے:

جو سکھ سے سکھی ہو نہ دُکھ سے دُکھی
نہ خوف اس کو آئے نہ غصہ کبھی
نہ جذبوں کے جنجال میں آئے وہ
مُنی قائم العقل کہلائے وہ
بُرائی جو پہنچے تو نالاں نہ ہو
بھلائی جو پائے تو شاداں نہ ہو
کسی سے تعلق نہ اس کو لگاؤ
یہی قائم العقل کا ہے سبھاؤ
نہ اشیائے ظاہر سے اس کو لگن
ہے آنند سے آتما میں مگن
جو برہم یوگ ہی سے سروکار ہے
دوامی مسرت میں سرشار ہے

اوپر کی سطور میں ناچیز مترجم نے "گیتا" کے مطالعے کے لیے فلسفے کی الجھنوں اور علمی مباحث سے قطع نظر کرکے سیدھے سادے الفاظ میں "گیتا" کی تعلیمات کا اظہار کردیا ہے، بوجہ قلتِ گنجائش بہت سے نکات درج ہونے سے رہ گئے ہیں۔ غور سے مطالعہ کرنے والے کے لیے اس مختصر سی کتاب میں سیکڑوں ہزاروں اسرار موجود ہیں، جن کے سمجھنے کے لیے استعداد توجہ اور محنت کی ضرورت ہے۔ ناظرین بغور مطالعہ کریں اور اپنی بساط کے مطابق عرفان حاصل کریں کیونکہ حصولِ عرفان ہی مقصدِ زندگی ہے۔

□□□

ہمارا نیا ای میل آئی ڈی

Email:urduduniyancpul@yahoo.co.in

قومی اردو کونسل اور ماہ نامہ "اردو دنیا" اور سہ ماہی "فکر و تحقیق" سے خط و کتابت بذریعہ ای میل اب اس پتے پر کریں۔

اردو خبرنامہ

جدہ میں پہلی عالمی اردو کانفرنس

● جدہ۔ 8 جون، سعودی عرب کے شہر جدہ میں مشرق وسطیٰ کی پہلی عالمی کانفرنس کا آغاز اس عہد کے ساتھ ہوا کہ اردو کے بین الاقوامی رابطوں کو مضبوط بنانے اور اردو کی نئی بستیوں میں زبان کی تعلیم اور اس کے فروغ کی سنجیدہ کوششیں کی جائیں گی۔ جدہ میں ہندستانی قونصل خانہ اور مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی حیدرآباد کے اشتراک سے منعقدہ اس کانفرنس کا افتتاح ہندوستانی قونصل جنرل سید اوصاف سعید نے کیا۔ انھوں نے اپنی افتتاحی تقریر میں کہا کہ اردو صرف برصغیر کی زبان نہیں بلکہ اردو روس، یوروپ، برطانیہ، کینیڈا اور امریکہ کے بیشتر علاقوں میں مقبول ہے۔ برصغیر سے باہر کئی ملکوں کی یونیورسٹیوں اور اسکولوں میں دوسری زبانوں کے علاوہ اردو بھی پڑھائی جاتی ہے۔ انھوں نے کہا کہ گذشتہ سال اسکاٹ لینڈ میں اردو کی تعلیم کو ہائر گریڈ میں پڑھانے کی اجازت حاصل ہوگئی ہے۔ اردو پہلی غیر یوروپی زبان ہے جس کو یہ اعزاز ملا ہے۔ انھوں نے اس بات پر افسوس کا اظہار کیا کہ جہاں اردو ساری دنیا میں پھیل رہی ہے وہیں خود ہمارے گھروں میں سکڑ رہی ہے۔ انھوں نے کہا کہ جدہ اردو کا ایک اہم مرکز ہے اور یہاں اردو کے فروغ کے لیے بہت کام ہو رہا ہے۔ صدارتی خطبے کے بعد مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے قیام کے مقصد کو سامنے رکھ کر مسلسل کوشش کر رہے اردو یونیورسٹی کے پرووائس چانسلر پروفیسر اقبال احمد نے استقبالیہ پیش کیا۔ اس موقع پر پروفیسر وہاب قیصر نے عالمی اردو کانفرنس کا تعارف پیش کیا۔ مہمان خصوصی کے طور پر قومی اردو کونسل کے وائس چیرمین جناب چندر بھان خیال نے اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ یہ حقیقت ہے کہ اردو ساری دنیا میں پھیل رہی ہے لیکن اس کا اسکرپٹ سمٹ رہا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اس اسکرپٹ کو بچایا جائے۔ انھوں نے کہا کہ بنیادی سطح پر اردو تعلیم کے بغیر اردو کا تحفظ ممکن نہیں ہے۔ اردو کے فروغ میں ذرائع ابلاغ کے کردار پر روشنی ڈالتے ہوئے مشہور صحافی معصوم مرادآبادی نے کہا کہ اردو اخبارات و رسائل کے علاوہ ابلاغ کے جدید ذرائع سے اردو کے فروغ و اشاعت میں خاصی مدد مل رہی ہے۔ انھوں نے کہا کہ اردو اخبارات جدید ٹیکنالوجی سے بھرپور استفادہ کر رہے ہیں اور وہ پوری تندہی سے زبان کے فروغ میں منہمک ہیں۔ ساہتیہ اکادمی کے سابق چیرمین پروفیسر گوپی چند نارنگ نے اپنے خطاب میں کہا کہ اردو پوری دنیا میں خوشبو کی طرح پھیل رہی ہے۔ انھوں نے کہا کہ عربی زبان کے اس اساسی خطے میں اردو کی گونج ایک عجوبہ ہے۔ میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اردو کا دامن پکڑ کر ارض مقدس پر آؤں گا۔ انھوں نے کہا کہ عرب ممالک میں مشاعروں کا چلن تو برسوں سے ہے لیکن تعلیمی مسائل پر پہلی بار کسی عرب ملک میں یہ کانفرنس منعقد ہو رہی ہے۔

قبل ازیں گذشتہ شب انڈین قونصلیٹ جدہ کے تعاون سے ایک نہایت کامیاب مشاعرہ منعقد ہوا جس کی صدارت جناب چندر بھان خیال نے کی اور نئی نسل کے ہندستانی شعرا نے اپنی ابھرتی ہوئی صلاحیتوں کا اظہار کیا۔ اس کانفرنس میں لندن سے پروفیسر ضیاالدین شکیب، کینیڈا سے ڈاکٹر تقی عابدی، قطر سے عبدالکریم چوگلے کے علاوہ پروفیسر فہیم حنفی، حسام صدیقی، ظفر علی، ڈاکٹر بصیر احمد خاں، زاہد علی خاں (ایڈیٹر سیاست حیدرآباد) سمیت اردو کے ممتاز اسکالرز شریک ہوئے۔ (ہندوستان ایکسپریس، نئی دہلی)

نظم کے تجزیے پر ورکشاپ

● علی گڑھ۔ 8 جون، نظم کے تجزیے پر 9 تا 12/جون چار روزہ ورکشاپ ڈی. ایس. اے. شعبۂ اردو اور اردو اکادمی کے اشتراک سے منعقد کی گئی جس کے افتتاحی اجلاس کی صدارت اسلوب احمد انصاری نے فرمائی۔ مہمان خصوصی کی نشست ڈاکٹر اسلم پرویز نے قبول فرمائی۔ جبکہ نظامت کے فرائض شعبۂ اردو کے استاد ڈاکٹر سراج اجملی نے انجام دیے۔ اس پروگرام کی نگرانی صدر شعبۂ اردو پروفیسر خورشید احمد کر رہے تھے۔ موضوع کا تعارف ڈین فیکلٹی آف آرٹس پروفیسر ابوالکلام قاسمی نے پیش کیا۔ اس موقع پر تیرہ نظموں کے تجزیوں پر مشتمل راشد انور راشد کے مضامین کے مجموعے کی رونمائی صدر جلسہ اسلوب احمد انصاری اور مہمان خصوصی اسلم پرویز نے کی۔ پروگرام کا آغاز قاری امین اسلام کی آواز میں تلاوت کلام پاک سے ہوا۔ استقبالیہ تقریر میں پروفیسر خورشید احمد نے غزل اور نظم کے تامیاتی کل پر بحث کرتے ہوئے نظموں کے تجزیے کے آغاز وارتقا پر گفتگو کی اور اس سلسلے میں میراجی، اسلوب احمد انصاری، بلراج کومل، شمس الرحمٰن فاروقی، وزیر آغا اور حامدی کاشمیری کے تجزیوں پر گفتگو کی۔ پروفیسر ابوالکلام قاسمی نے موضوع کا تعارف کراتے ہوئے حالی سے لے کر حال تک کی شاعری کے تجزیاتی مطالعات پر مفصل روشنی ڈالی۔ ڈاکٹر اسلم پرویز نے اپنی گفتگو میں نظم اور غزل کے مابین فرق کو بیان کیا

اور اس امر کی وضاحت کی کہ نظم دو طرح کی ہوتی ہے۔ آوٹ لائن کے بغیر اور آوٹ لائن کے تابع۔ صدارتی کلمات میں اسلوب احمد انصاری نے کہا کہ اردو میں تجزیاتی مطالعے کا آغاز ایک انوکھے سج دھج کے شاعر میراجی نے کیا جسے خشت اول قرار دیا جائے تو بہتر ہوگا۔ انھوں نے نظم اور غزل کے درمیان فرق قائم کرتے ہوئے فرمایا کہ نظم میں Semantic اور غزل میں Emotive logic کا استعمال ہوتا ہے۔ نظم میں ہمارا سروکار معاشرتی نظام سے ہوتا ہے اور غزل میں وجدان سے نیز انھوں نے مشورہ دیا کہ ہمیں غزل کا بھی ویسے ہی مطالعہ کرنا چاہیے جیسے نظموں کا کرتے ہیں۔ اردو اکادمی کے ڈائریکٹر اور ڈی.ایس.اے کے کوآرڈینیٹر پروفیسر قاضی افضال حسین نے کانفرنس اور ورک شاپ کے انعقاد کے مقاصد پر روشنی ڈالی۔ اس اجلاس میں پروفیسر قاضی عبدالستار، پروفیسر عتیق اللہ، ڈاکٹر تصدق اور دیگر صاحب نظر اشخاص کے ساتھ ساتھ بڑی تعداد میں ریسرچ اسکالرز نے شرکت کی۔ (ہمارا سماج، نئی دہلی)

جوش ملیح آبادی پر سہ روزہ بین الاقوامی سیمینار

● دہلی۔ 16 مئی کو افتتاحی اجلاس کا آغاز کرتے ہوئے جناب شاہد ماہلی ڈائرکٹر غالب انسٹی ٹیوٹ نے فرداً فرداً تمام اراکین کا شکریہ ادا کیا اور تمام اراکین کا گلدستوں سے خیر مقدم کیا افتتاحی تقریر کرتے ہوئے پروفیسر سید محمد عقیل رضوی نے جوش کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی۔ انھوں نے کہا کہ جوش صاحب نے اپنی تہذیبی وراثت، وطنیت اور دیگر تہذیبی امور کو ہی اپنی شاعری کا مرکز ومحور بنایا ہے۔ انھوں نے جوش صاحب کی مختلف نظموں پر سن اشاعت کے حوالے سے بھرپور روشنی ڈالی۔ افتتاحی اجلاس کے دوسرے مقرر جناب اقبال حیدر نے، جو کنیڈا سے تشریف لائے تھے افسوس کے ساتھ کہا کہ جوش صاحب کو ہندوستان نے نظر انداز کر دیا ہے اور پاکستان نے قبول نہیں کیا اور دو ممالک کے رشتوں میں تلخی کے سبب ایک شاعر انقلاب ورومان کے ساتھ ناروا سلوک کیا گیا۔ انھوں نے جوش صاحب کی پرزور وکالت کی۔

ہالینڈ سے تشریف لائے جناب اسد مفتی نے کہا کہ میرا میدان عمل فلم ہے لہذا میں ان کو فلموں اور ڈاکومینٹری کے حوالے سے موضوع بحث بناتا ہوں۔ جوش صاحب کے قیام پاکستا کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ وہاں انھیں پاکستانی شہریت کا مسئلہ ہمیشہ پریشان کرتا رہا۔ افتتاحی اجلاس کے چوتھے مقرر خواجہ حسن ثانی نظامی صاحب نے جوش کو منفرد لب ولہجہ کا شاعر قرار دیا انھوں نے کہا جوش صاحب بڑے بھولے آدمی تھے۔ بدقسمتی سے وہ ایسے ملک میں تشریف لے گئے جہاں ہمیشہ غیر ضروری معاملات پر بحث ہوتی رہتی ہے۔

صدارتی خطبہ میں جناب سید شاہد مہدی نے کہا کہ کسی بھی شاعر کو اس کی شخصیت سے الگ ہٹ کر پرکھنا چاہیے۔ انھوں نے غالب کی مثال دیتے ہوئے کہا کہ غالب کامل انسان نہیں تھے لیکن ایک اچھے اور بڑے شاعر ضرور تھے۔ آخر میں شاہد ماہلی نے تمام مقررین اور سامعین حضرات کا شکریہ ادا کیا۔ بعد ازاں ضلع خاں نے شام غزل کے پروگرام میں غالب کا کلام سنایا، جس سے سامعین محظوظ ومسرور ہوئے۔

بین الاقوامی جوش سمینار بہ عنوان ''جوش ملیح آبادی فکر وفن'' میں دوسرے دن کے پہلے اجلاس میں پروفیسر سید محمد عقیل رضوی اور جناب اسد مفتی نے صدارت کے فرائض انجام دیے۔ نظامت ڈاکٹر سہیل انور نے کی۔ مقالہ نگاروں میں ڈاکٹر کوثر مظہری، ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید اور پروفیسر فضل امام تھے۔ دوسرے اجلاس کی صدارت پروفیسر فضل امام اور ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید نے انجام دی او رنظامت ڈاکٹر محمد اکمل نے کی۔ اس اجلاس میں سید محمد عقیل رضوی، پروفیسر وہاب اشرفی، پروفیسر ابو الکلام قاسمی اور محترمہ شائستہ رضوی نے مقالے پیش کیے۔ مقالوں پر سوالات وتاثرات کا لمبا سلسلہ چلا۔ تیسرا اجلاس سہ پہر ڈھائی بجے شروع ہوا جس کی صدارت پروفیسر قمر رئیس اور پروفیسر عتیق اللہ نے کی اور نظامت ڈاکٹر شعیب رضا خاں نے۔ اس اجلاس میں ڈاکٹر نعیم السحر اور ڈاکٹر فرید پربتی نے اپنے مقالے پیش کیے۔ صدارتی کلمات میں پروفیسر عتیق اللہ اور پروفیسر قمر رئیس نے مقالات کی روشنی میں تاثرات پیش کیے۔ چوتھے اجلاس کی صدارت کے فرائض پروفیسر صادق اور پروفیسر علی احمد فاطمی نے انجام دیے جبکہ نظامت ظہیر ربانی نے کی۔ ڈاکٹر لئیق رضوی اور پروفیسر لطف الرحمٰن نے مقالے پیش کیے۔ لئیق رضوی کے مقالے کا موضوع ''جوش کی شخصی مرثیہ نگاری'' تھا۔ پروفیسر لطف الرحمٰن نے ''جوش اور غزل گوئی'' کے موضوع پر مقالہ پیش کیا ہے جس پر صدارتی خطبے کے دوران اختلافات بھی ابھر کر آئے کہ جوش بنیادی طور پر نظم گو شاعر ہیں اور آخر میں جناب شاہد ماہلی نے تمام مقالہ نگاروں، صدور اور سامعین حضرات کا شکریہ ادا کیا۔

تیسرے دن کے پہلے اجلاس کی صدارت پروفیسر وہاب اشرفی اور پروفیسر عتیق اللہ نے انجام دی، اور نظامت ممتاز عالم نے کی۔ اس اجلاس کے پہلے مقالہ نگار پر پروفیسر قمر رئیس نے جوش کی شاعری میں احتجاجی رویے کی اہمیت پر مقالہ پیش کیا۔ دوسرے مقالہ نگار ڈاکٹر خلیق انجم نے ''صف اول کے مکتوب نگار جوش ملیح آبادی'' کے عنوان سے مقالہ پیش کیا۔ جناب زبیر رضوی کا مقالہ ''جوش کا تخلیقی شعور'' قیام پاکستان کی تین دہائیوں کے تناظر پر مبنی تھا جس میں انھوں نے قیام پاکستان کے دوران جوش کے تذبذب وکشمکش سے گذرے ایام کا ذکر مختلف جہتوں سے کیا۔ چائے کے وقفے کے بعد دوسرا اجلاس شروع ہوا جس کی صدارت پروفیسر لطف الرحمٰن اور ڈاکٹر سلیمان اطہر

جاوید نے انجام دی اور نظامت محترمہ وسیم راشد نے اس اجلاس پر وفیسر شمیم حنفی، پروفیسر عتیق اللہ اور جناب اقبال حیدر نے اپنے مقالے پیش کیے صدارتی خطبے میں پروفیسر لطف الرحمٰن نے پروفیسر عتیق اللہ کے مقالے پر عہد قدیم اور عہد جدید کے حوالے سے اور پروفیسر شمیم حنفی کے مقالے پر فراق اور جوش کے تقابلی مطالعے کے انداز میں روشنی ڈالی۔ جناب اقبال حیدر کے مقالے کے سلسلے میں انھوں نے کہا کہ جناب اقبال حیدر نے جوش کی شاعری کے مختلف پہلوؤں کا احاطہ کیا ہے۔ لنچ کے وقفہ کے بعد تیسرا اجلاس شروع ہوا جس کی صدارت جناب زبیر رضوی اور ڈاکٹر علی جاوید نے کی اور نظامت کے فرائض ڈاکٹر شاہینہ تبسم نے انجام دیے۔ مقالہ نگاروں میں پروفیسر علی احمد فاطمی، ڈاکٹر مولا بخش اور ڈاکٹر عقیل احمد تھے مقالوں پر صدارتی کلمات میں جناب زبیر رضوی اور ڈاکٹر علی جاوید نے مضامین کے مختلف پہلوؤں پر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

اختتامی اجلاس تقریباً چھ بجے شروع ہوا۔ اس میں تاثرات پیش کرتے ہوئے جناب محی احمد اور محترمہ نعیم السحر نے تین روزہ سیمنار پر تاثرات پیش کیے۔ عبد الرحمٰن صاحب نے مشورہ دیتے ہوئے کہا کہ سیمنار کے آداب وضوابط پر بھی ایک سیمنار ہونا چاہیے۔ ان کے علاوہ تاثرات پیش کرنے والوں میں جناب خالد علوی' پروفیسر سید محمد عقیل رضوی، جناب اسد مفتی، ڈاکٹر مولا بخش، جناب اقبال حیدر، محترمہ شائستہ رضوی، پروفیسر علی احمد فاطمی اور ڈاکٹر خلیق انجم شامل تھے۔ اختتامی اجلاس کے آخری لمحے میں بی بی سی لندن کے سابق نامہ نگار محترم یاور عباس نے تاخیر سے آنے کی معذرت کرتے ہوئے جوش کے حوالے سے فکر انگیز خیالات پیش کیے۔ انھوں نے کہا کہ جوش کی ''یادوں کی برات'' کے جو منفی تاثرات قارئین پر مرتب ہوتے ہیں ان کو اگر نظر انداز کر دیا جائے تو جوش پر از سر نو سنجیدگی سے غور کرنے کی ضرورت ہے۔

(ڈاک سے)

اردو اکادمی فیلوشپ کا آغاز

● نئی دہلی۔ 14 جون، اردو اکادمی دہلی کی طرف سے اردو کے معروف قلمکاروں کو فیلوشپ دیے جانے کا باقاعدہ آغاز ہو گیا ہے۔ اس سلسلے میں آج غالب اکیڈمی حضرت نظام الدین میں' جلسہ تفویض اردو اکادمی فیلوشپ' کا انعقاد کیا گیا جس کی صدارت معروف فکشن نگار دیویندر اسر نے کی۔ نظامت کے فرائض انیس اعظمی نے انجام دیے۔ اس موقع پر اردو اکادمی کی جانب سے معروف شاعر اور ادیب رفعت سروش، مشہور انگریزی صحافی عابد سہیل اور معروف تخلیق کار وفادار پروفیسر عتیق اللہ کو پہلی فیلوشپ دو سال کے لیے دی گئی ہے جس کے تحت انھیں 5 ہزار روپے ماہانہ دیے جائیں گے۔ اس دوران عابد سہیل ''فکشن کی تنقید'' رفعت سروش ''میرا ادبی سفر'' اور پروفیسر عتیق اللہ ''مارکسیت اور اس کی نئی تعبیرات'' کے موضوع پر کام کریں گے جسے بعد میں اردو اکادمی کتاب کی شکل میں شائع کرے گی۔ اس موقع پر رفعت سروش کی تخلیقات کا تجزیہ معروف شاعر اور صحافی محمود سعیدی نے، عابد سہیل کی تخلیقات کا تجزیہ ڈاکٹر ارجمند آرا نے اور پروفیسر عتیق اللہ کی تخلیقات کا تجزیہ ڈاکٹر سہیل فاروقی نے پیش کیا۔

پروگرام کے آغاز میں اکادمی کے وائس چیئر مین پروفیسر قمر رئیس نے ان تینوں فیلوشپ یافتگان کا مختصر تعارف پیش کرتے ہوئے اردو زبان وادب کے لیے ان کی خدمات کی ستائش کی۔ رفعت سروش کے بارے میں انھوں نے کہا کہ وہ انھیں اس وقت سے پڑھتے آرہے ہیں جب وہ اسکول میں طالب علم تھے۔ انھوں نے ریڈیو پر رہتے ہوئے اردو کی جس طرح سے تشہیر کی وہ اپنی مثال آپ ہے۔ انھوں نے شاعری ڈراما، افسانہ، خودنوشت نگاری میں کارہائے نمایاں انجام دیے اور معیاری ادب تخلیق کیا۔ عابد سہیل کے تعلق سے انھوں نے کہا کہ انگریزی اخبارات میں کام کرتے ہوئے انھوں نے اردو زبان وادب کو کبھی نظر انداز نہیں کیا بلکہ پورے انہماک سے اردو کی خدمت کی۔ پروفیسر عتیق اللہ کی بابت اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے قمر رئیس نے کہا کہ انھوں نے اپنی تخلیقی اور تنقیدی سرگرمیوں سے اپنی ایک منفرد شناخت قائم کی اور ساتھ ہی دہلی یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کا نام بھی روشن کیا۔ وہ بہت سے اداروں اور رسالوں سے وابستہ رہے اور اپنی تخلیقی صلاحیتوں کے جوہر دکھائے۔ وہ تخلیقی فنکار بھی ہیں اور علمی وتنقیدی صلاحیتوں سے بھی مالا مال ہیں۔

(راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

عادل منصوری کے اعزاز میں نشست

● نئی دہلی۔ 31 مئی، اردو کے معروف شاعر اور مصور عادل منصوری (نیو جرسی، امریکہ) کے اعزاز میں جامعہ نگر کے حبیب باغ میں ایک نشست کا انعقاد کیا گیا۔ عادل منصوری جو امریکہ میں مقیم ہیں، گزشتہ دنوں حکومت گجرات کے محکمہ ثقافت کے ذریعہ دیا جانے والا 'ولی گجراتی ایوارڈ' لینے کے لیے ہندوستان آئے ہیں۔ دہلی میں ان کے ایک روزہ قیام کے دوران انھیں یہ استقبالیہ دیا گیا۔ ان کے اعزاز میں منعقد اس نشست میں ہندستانی شاعری کے عمومی میلانات اور موجودہ رجحانات پر گفتگو ہوئی۔ حاضرین جلسہ نے مشاعروں کے موجودہ ماحول پر جہاں اپنی تشویش کا اظہار کیا وہیں یہ بھی کہا کہ آج کل عام طور سے ادبی وتنقیدی مضامین چبائے ہوئے نوالے بن چکے

ہیں۔ عادل منصوری چونکہ اردو کے علاوہ گجراتی زبان کے بھی شاعر ہیں اس لیے انھوں نے گجراتی ادب کے موجودہ منظر نامے پر بھی گفتگو کی اور کہا کہ گجراتی میں جو غزلیں کہی جارہی ہیں ان میں نئے مضامین کی تلاش پر زیادہ زور ہے۔ گجراتی زبان کے مشاعروں میں شاعری کی وہی ہیئت مقبول ہے جسے ہم اردو والے غزل کہتے ہیں۔ اس موقع پر زبیر رضوی نے کہا کہ آج کل کا مروجہ صارفی کلچر ایک طرح سے زبان وتہذیب کی نفی کرنے والا ہے۔ گلیمر کے نام پر جن چیزوں کو رائج کیا جارہا ہے اور شہرت دی جارہی ہے اپنے آپ میں وہ ایک وقتی اور عارضی شے ہے اور اس سے معاشرے کو کوئی خاص فائدہ حاصل ہونے والا نہیں ہے۔ ڈاکٹر شہپر رسول نے کہا کہ ان دنوں اردو کی نئی بستیوں کا بہت شور ہے لیکن ہمیں یہ بھی دھیان میں رکھنا چاہیے کہ اردو کی ان نئی بستیوں کی ساری روشنی انھیں پرانے باسیوں کی وجہ سے ہے جو برصغیر سے ہجرت کرکے وہاں آباد ہیں۔ وہاں پر پروان چڑھنے والی نئی نسل اردو سے بیگانہ ہی ہے۔ اس نشست میں لوگوں کا مجموعی خیال یہی تھا کہ شعر وادب کے غیر معمولی شور میں زبان وادب کی ترسیل اور ترویج کا سلسلہ بہت مدھم ہوتا جارہا ہے۔ اس کی کچھ وجہ تو ہماری غفلت اور بے پروائی ہے اور اس کا کچھ ذمے دار ہمارا وہ معاشرہ بھی ہے جس میں اردو کیا اس وقت کسی بھی زبان کے ادب کو اور اس کے ادیب کو وہ اہمیت حاصل نہیں جو ایک کھلاڑی کو حاصل ہے یا کسی فلمی ایکٹر کو نصیب ہے۔ ڈاکٹر احمد محفوظ نے کہا کہ اس وقت اردو کے علاوہ دیگر زبانوں میں جو شاعری ہورہی ہے اس پر غزل کا جادو ہی سر چڑھ کر بول رہا ہے۔ انھوں نے کہا کہ گذشتہ چار دہائیوں سے عادل منصوری جدیدیت کے نہایت معتبر اور نمائندہ شاعر اور فن کار کے طور پر پوری اردو دنیا میں معروف ومقبول ہیں۔ خالد بن سہیل نے کہا کہ عادل منصوری کی شاعری کی دنیا میں جو حیثیت ہے وہ تو مسلم ہے مگر میں انھیں ایک بہت اچھے آرٹسٹ کے طور پر جانتا ہوں۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ وہ دونوں کام ایک ساتھ نہایت عمدگی کے ساتھ انجام دیتے ہیں۔ نشست میں شاہد علی خاں، پروفیسر وہاج الدین علوی، ڈاکٹر شہپر رسول، ڈاکٹر احمد محفوظ، ڈاکٹر سہیل احمد فاروقی، جناب خورشید اکرم، خالد بن سہیل اور عمیر منظر نے شرکت کی۔ (راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

شعبۂ سنسکرت اے ایم یو کا قدیم ترین شعبہ ہے

● علی گڑھ۔ 23 مئی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ سنسکرت کی میگزین "پراچے پرگیا" کا اجرا آج علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی آرٹس فیکلٹی کے ڈین پروفیسر ابوالکلام قاسمی نے کیا۔ پروفیسر ابوالکلام قاسمی نے کہا کہ سنسکرت زبان کو مزید اہم بنانے کے لیے اس کا ماڈرن زندگی میں زیادہ سے زیادہ استعمال کیا جانا چاہیے۔ انھوں نے کہا کہ سنسکرت جس سے متعدد ہندوستانی زبانیں پیدا ہوئی ہیں، اس کے لیے ہندی کے ساتھ مل کر کام کرنے کے کافی امکانات موجود ہیں۔ انھوں نے کہا کہ سنسکرت میں شاعری کرنے والے کویوں اور کہانی لکھنے والے مصنفین کی بھی حوصلہ افزائی کی جانی چاہیے اور ہندی کی لغت تیار کرتے وقت انگریزی کے بجائے سنسکرت کی مدد لی جانی چاہیے۔ پروفیسر قاسمی نے کہا کہ سنسکرت اور فارسی میں جو یکسانیت ہے اس پر بھی کام کیے جانے کی ضرورت ہے۔ انھوں نے میگزین کی اشاعت پر مسرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ کسی بھی شعبے کی پہچان اس کے تحقیقی کاموں سے ہوتی ہے اور تحقیقی میگزین کی مسلسل اشاعت اس بات کی علامت ہے کہ شعبہ میں مسلسل تحقیقی کام ہورہا ہے۔ انھوں نے سنسکرت کی بنیاد کو مزید مضبوط بنائے جانے کی ضرورت پر زور دیا۔

شعبۂ سنسکرت کے سربراہ پروفیسر ستیہ دیو کوشک نے اپنے استقبالیہ خطبے میں کہا کہ شعبۂ سنسکرت اے. ایم. یو. کا قدیم ترین شعبہ ہے اور اس ادارہ کے بانی سرسید احمد خاں کا سنسکرت کے تئیں ہمیشہ ہمدردانہ نقطۂ نظر رہا۔ انھوں نے بتایا کہ سرسید کے دور میں عربی اور فارسی موضوعات کا انتخاب کرنے والے طلبہ کو ایک روپے اسکالرشپ اور سنسکرت کا انتخاب کرنے والے طلبہ کو 2 روپے اسکالرشپ ملتی تھی۔ انھوں نے بتایا کہ اے.ایم. یو. میں اس کے قیام سے ہی سنسکرت کی تعلیم کا عمل مسلسل جاری ہے۔ میگزین کے مدیر اور شعبۂ سنسکرت کے ریڈر ڈاکٹر خالد بن یوسف خاں نے کہا کہ اس تحقیقی میگزین میں اے.ایم. یو. کے قلم کاروں کے علاوہ نالندہ، بہار، گرو کل کانگڑی، جموں یونیورسٹی، کشمیر اور آگرہ یونیورسٹی کے قلم کاروں کو شامل کیا گیا ہے جس سے اس میگزین کی مقبولیت کو بہتر طور پر سمجھا جاسکتا ہے۔ انھوں نے بتایا کہ یہ یونیورسٹی کی 22 ویں میگزین ہے۔ آخر میں شعبۂ سنسکرت کی ریڈر ڈاکٹر رانی مجمدار نے حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔ نظامت کے فرائض محمد اسلم نے انجام دیے۔ تقریب اجرا میں رئیس الدین خاں نے قرآن کریم کی تلاوت کی اور رویندر کمار چودھری نے وید کا پاٹھ کیا۔ شعبہ کے طلبہ وطالبات نے یونیورسٹی ترانہ کا سنسکرت ترجمہ پیش کیا۔ اس موقع پر پروفیسر اے آر قدوائی، پروفیسر عارف نذیر، پروفیسر آر سی شرما، ڈاکٹر ٹی بی چکرورتی، ڈاکٹر رمیش چندر راوت اور ڈاکٹر ایچ. ایس. آچاریہ بھی موجود تھے۔ (راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

ووٹر لسٹیں اردو میں بھی دستیاب کرائی جائیں گی

● سہارنپور۔ 23 مئی، شہری ترقیاتی محکمے کے سکریٹری اور الیکشن کمیشن کے مشاہد سچدانند کے مطابق جن انتخابی حلقوں میں اردو جاننے والوں کی تعداد 20 فیصد سے زائد ہوگی ان حلقوں میں ووٹر لسٹیں اردو میں دستیاب کرائی

جائیں گی۔ اس کے لیے ضلع انتظامیہ کو ان حلقوں کی شناخت کرانی ہوگی۔ واضح رہے کہ 2001 کی مردم شماری کے مطابق ضلع سہارنپور میں اردو جاننے والوں کی تعداد 24 فیصد سے زائد بتائی گئی ہے۔ یہاں سرکٹ ہاؤس میں ووٹر لسٹوں سے متعلق ضروری ہدایات دیتے ہوئے الیکشن کمیشن کے آبزرور نے واضح طور پر کہا کہ اگر ووٹر لسٹ پر نام، پتہ، فوٹو اور ایپک نمبر نہیں ہوگا تو ایسا شخص ووٹ نہیں بدل ڈال سکے گا۔ انھوں نے کہا کہ 10 جون 2008 تک ایسی تمام ووٹر لسٹیں مکمل کرلی جائیں۔ ضلع میں ایسے لاکھوں ووٹر ہیں جن کے فوٹو اور ایپک نمبر ووٹر لسٹ میں نہیں ہے۔ مشاہد نے ضلع افسران کو ہدایات دیں کہ ووٹر لسٹوں کی اس خامی کو جلد از جلد دور کرائیں اور ووٹر لسٹوں کو صد فیصد مکمل کرلیں۔ مشاہد نے ووٹر لسٹوں میں فوٹو اور ایپک نمبر کے کام کو تحصیل کی سطح پر کرائے جانے اور آن لائن فوٹو بنائے جانے کی بھی ہدایات دیں۔ ضلع مجسٹریٹ آلوک کمار نے بتایا کہ جن کا ایپک نمبر ووٹر لسٹ میں نہیں ہے وہ 001 نمبر فارم بھر کر 2 پاسپورٹ سائز فوٹو کے ساتھ جمع کرادیں۔ سہارنپور آمد پر کمیشن کے مشاہدے نے ان بوتھوں کا دورہ بھی کیا جہاں 5 فیصد نئے ووٹروں کا اضافہ ہوا ہے۔ مشاہد نے لسٹوں سے مرنے والوں کے ناموں کے اخراج کے ساتھ پتہ بدل جانے والے ووٹروں کی لسٹ کے جائزے کی بھی ہدایات دیں۔ ضلع مجسٹریٹ آلوک کمار نے بتایا کہ جن کا ایپک نمبر ووٹر لسٹ میں نہیں ہے وہ 001 نمبر فارم بھر کر 2 پاسپورٹ سائز فوٹو کے ساتھ جمع کرادیں۔ سہارنپور آمد پر کمیشن کے مشاہدے نے ان بوتھوں کا دورہ بھی کیا جہاں 5 فیصد نئے ووٹروں کا اضافہ ہوا ہے۔ مشاہد نے لسٹوں سے مرنے والوں کے ناموں کے اخراج کے ساتھ پتہ بدل جانے والے ووٹروں کی لسٹ کے جائزے کی بھی ہدایات بھی ضلع افسران کو دی ہیں۔

(راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

بس اسٹاپوں کا نام اردو میں بھی لکھنے کا مطالبہ

● نئی دہلی۔ 25 مئی، بازہ ہندوراؤ کے سماجی کارکن رفیق احمد نے دہلی حکومت کے وزیر ٹرانسپورٹ ہارون یوسف سے مطالبہ کیا ہے کہ دہلی کی سڑکوں پر بنے بس اسٹاپ پر ان کے نام ہندی اور انگریزی کے ساتھ ساتھ اردو میں بھی لکھے جائیں۔ انھوں نے کہا کہ یوں تو دہلی میں میونسپل کارپوریشن اور دہلی حکومت نے اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ دیا ہوا ہے لیکن یہ صرف کاغذوں تک ہی محدود ہے۔ انھوں نے کہا کہ دہلی ہندوستان کی راجدھانی ہے یہاں پوری دنیا سے عوام آتے جاتے ہیں اور ہندوستان کے دوسرے صوبے اتر پردیش، بہار، ہریانہ، پنجاب اور اتراچل سے آنے والے اور بسوں کا استعمال کرنے والے عوام اردو زبان سے اچھی طرح واقف ہوتے ہیں اور انھیں دہلی شہر میں آکر اس وقت پریشانی اٹھانی پڑتی ہے جب لوگ بس اسٹاپ پر کھڑے ہو کر یہ معلوم کرتے ہیں کہ یہ کون سا بس اسٹاپ ہے اور رہی سہی کسر بلیو لائن والے پوری کردیتے ہیں وہ سواریوں کو غلط بس اسٹاپ پر اتار جاتے ہیں۔

(صحافت، نئی دہلی)

اردو جرنلزم کا رزلٹ صد فی صد

● پٹنہ۔ 4 جون، پٹنہ یونیورسٹی میں شعبۂ اردو کے تحت چلنے والے کورس ''پی جی ڈپلوما ان اردو جرنلزم اینڈ ماس کمیونکیشن'' کے پہلے سیشن کے امتحان 2008 کے نتائج کا اعلان کردیا گیا ہے۔ جس میں ایک طرف جہاں صد فیصد امتحان دہندگان نے فرسٹ کلاس سے شاندار کامیابی حاصل کی ہے وہیں دوسری طرف سات امتحان دہندگان کو ڈسٹنکشن ملا ہے۔ یہ اطلاع دیتے ہوئے شعبۂ اردو کے صدر اور پی جی ڈپلوما کورس کے ڈائرکٹر ڈاکٹر اسرائیل رضا نے بتایا کہ اعلان شدہ نتائج کے مطابق سات امتحان دہندگان کو جن میں ابو الکلام آزاد، محمد وثیق الزماں، افسانہ ہارون، توقیر عالم، عتیق الزماں، افضال نواز حیدر اور محمد نظام الدین شامل ہیں، 75 فیصد (ڈسٹنکشن) سے زائد نمبر حاصل ہوئے ہیں۔ جب کہ 75 فیصد سے کم مگر 70 فیصد سے زیادہ نمبر حاصل کرنے والوں میں علی راشد تنویر حسن، محمد مشتاق خان، غزالہ شمیم، سراج الدین، ایس ایم سفیر الدین، نصرت پروین، توقیر عالم، شہلا خانم، شاذیہ سمرین، نثار احمد، طارق انور، نصرت جہاں، رضیہ سلطانہ، صفیہ جمیل، محمد صلاح الدین، صادقہ خاتون، آفتاب عالم، ایس منیر اقبال ہاشمی کل 19 امتحان دہندگان شامل ہیں۔ اس میں سے ایک طالب عالم کا نتیجہ رجسٹریشن کے سبب زیر التوا ہے۔ صرف چار امتحان دہندگان شگفتہ پروین، روحی نگار، سجاد قاسمی اور امتیاز احمد کو 70 فیصد سے کم مگر 61 سے زیادہ نمبرات حاصل ہوئے ہیں۔ ڈپلوما کورس کے کوآرڈینٹر اور شعبۂ اردو کے استاد ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی نے بتایا کہ اس ایک سالہ کورس کا یہ پہلا امتحان تھا جس میں کل 31 طلبا وطالبات نے امتحان کے فارم داخل کیے تھے جن میں 30 طلبہ شامل ہوئے۔ ایک طالب علم امتحان میں شامل نہ ہوسکا۔ صدر شعبۂ اردو ڈاکٹر اسرائیل رضا اور کورس کو آرڈینٹر ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی، پٹنہ یونیورسٹی کے ڈین آف اسٹوڈنٹس ویلفیئر ڈاکٹر اعجاز علی ارشد، شعبے کے سینئر استاد ڈاکٹر ایم عظیم اللہ اور کورس سے وابستہ اساتذہ راشد احمد، ریحان غنی، شباب انور، نریندر تیواری، دھرمکار، وی این پانڈے، محفوظ عالم، اعجاز ارشد، جاوید حیات، ریاض عظیم آبادی، اروند پانڈے، اعجاز کامل اور ایم ٹی خان وغیرہ نے تمام طلبہ کی شاندار کامیابی پر پرجوش مبارکباد پیش کی ہے۔ اور مید ظاہر کی ہے الیکٹرونک اور پرنٹ میڈیا میں اپنی نمایاں کارکردگی سے شعبۂ اردو اور پٹنہ یونیورسٹی کا نام روشن کرتے ہوئے ملک وملت کے لیے بہتر خدمات انجام دیں گے۔ (قومی تنظیم، پٹنہ)

کانگریس دفتر میں اردو میڈیا سیل کا قیام

● نئی دہلی۔ 28 مئی، دہلی پردیش کانگریس کمیٹی کے دفتر راجیو بھون نئی دہلی میں آج اردو میڈیا سیل کا قیام عمل میں آیا۔ اس موقع پر دہلی کے اردو

اخبارات کے نمائندوں کے علاوہ مسلم طبقے کے دانشور اور سیاسی لیڈر موجود تھے۔ حاضرین کو خطاب کرتے ہوئے کانگریس کے ریاستی صدر جے پرکاش اگروال نے اردو اخبارات کے مسائل اٹھانے اور سرکار سے ان کو اشتہارات ودیگر تعاون کی یقین دہانی کرائی۔ مسٹر اگروال نے کہا کہ دراصل اس سیل کا مقصد ملک کے ایک بڑے طبقے سے جڑنا ہے۔ عام طور سے اب تک یہ ہوتا آیا ہے کہ ہماری خبریں صرف انگلش اور ہندی اخبارات تک محدود رہ جاتی تھیں اور ملک کے اردوداں طبقے تک نہ تو ہماری بات پہنچ پاتی تھی اور نہ ان کے مسائل ہم تک پہنچتے تھے۔ مسٹر اگروال نے اردو کو ملک کی تاریخی زبان قرار دیتے ہوئے یہ بھی کہا کہ یہ کسی ایک مذہب یا فرقے کی زبان نہیں ہے بلکہ ملک کی آزادی میں اہم کردار ادا کرنے والی زبان ہے جو ہم سب کی زبان ہے۔ انھوں نے صحافیوں سے خاص طور سے آزادی میں حصہ لینے والے دہلی کے مسلم مجاہدین آزادی کے تذکرے کی طرف بھی خاص توجہ دینے کے لیے کہا۔ قبل ازیں ڈی پی سی سی کے صدر وممبر پارلیمنٹ جے پی اگروال نے ''ہمارا سماج'' کے ایڈیٹر خالد انور کے ساتھ حاضرین کی موجودگی میں کمپیوٹر پر پریس ریلیز کے ذریعے اردو میڈیا سیل کا باقاعدہ افتتاح کیا۔ اس کے بعد لوگوں نے اردو سے متعلق بہت سے مسائل بھی رکھے۔ (ہمارا سماج، نئی دہلی)

جامعہ رحمانی کے پچاس طلبہ انعامات سے نوازے گئے

● مونگیر۔ 6 جون، اسلام نے امن وآشتی کی تعلیم دی ہے۔ دہشت گردی کا تعلق نہ مدرسے سے ہے اور نہ مسلمانوں سے۔ مدارس تو ملک کے معمار تیار کرتے ہیں۔ مذکورہ خیالات کا اظہار ڈاکٹر اظہار احمد ایم.ایل.اے. نے جامعہ رحمانی مونگیر میں کامیاب طلبہ میں تقسیم انعام کے بعد کیا۔ ڈاکٹر شبیر حسن آر ڈی اینڈ ڈی جے کالج نے کہا کہ عصری درس گاہوں میں پڑھنے والے طلبہ کے سامنے صرف ایک مقصد ہوتا ہے۔ دنیا کی ترقی، لیکن آپ کا اصل مقصد سماج کی اصلاح اور دین کی رہنمائی ہے، آپ کا مقام اونچا اور منفرد ہے اس لیے آپ کی ذمہ داری دہری ہے۔ آپ کو مشاہدہ، مطالعہ اور مجاہدہ کرنے میں اپنی توتیں صرف کرنی چاہئے۔

شاہ محمد صدیقی انجینئر نے کہا کہ آج کا دور مقابلے کا دور ہے۔ ایسے دور میں جامعہ رحمانی میں مسابقوں کا اہتمام کیا گیا ہے۔ بلندی دنیا میں اسی کو حاصل ہوتی ہے جو لکھنے اور بولنے کا فن جانتا ہو۔ جامعہ رحمانی میں جو علمی وتعلیمی سہولت فراہم کی گئی ہے وہ بہت کم جگہوں میں ہے۔ ناظم تعلیمات جامعہ رحمانی مولانا مفتی محمد اظہر مظاہری نے کہا کہ جامعہ رحمانی میں سرپرست کی ایما پر متعدد تعلیمی اسکیمیں نافذ کی گئی ہیں۔ امتحان میں معیاری نمبر لانے والے طلبہ کو تعلیمی وظیفہ دیا جاتا ہے۔ حفظ قرآن مجید کا مسابقہ کرایا جاتا ہے اور ایک دن میں پورا قرآن سنا دینے والے طلبہ کو انعام سے نوازا جاتا ہے۔ پروفیسر اقبال حسن آزاد نے کہا کہ یہ مقابلے کا ہے مگر ہمیں خود آگے بڑھنے کے جذبے سے مقابلے میں حصہ لینا ہوگا۔ صدر انجمن نادیۃ الادب مولانا نعیم رحمانی نے کہا کہ جامعہ رحمانی میں طلبہ میں ہمہ جہت صلاحیت پیدا کی جاتی ہے اور اس کے لیے مختلف قسم کے مقابلے اور کوئز منعقد کیے جاتے ہیں۔ تقریر کا ایک ایسا مسابقہ بھی ہوتا ہے، جس میں عنوان کا تعین ڈائس پر تقریر سے عین قبل کیا جاتا ہے۔ کتب خانہ رحمانیہ مونگیر میں منعقد پروقار تقسیم انعام تقریب میں پچاس طلبا کو انعام سے نوازا گیا، جن میں 12 طلبہ کو انجمن نادیۃ الادب کے تحت ہونے والے مسابقوں میں کامیاب ہونے پر انعام سے نوازا گیا۔ 6 ایسے طلبہ کو انعام دیا گیا جنھوں نے ایسے تقریری مسابقے میں کامیابی حاصل کی جس کے عنوان کا تعین تقریر سے عین قبل ہوتا ہے۔ اذان اور نعت کے مقابلے میں کامیاب ہونے والے تین تین طلبہ کو بھی انعام سے نوازا گیا۔ ایک دن میں پورا قرآن مجید حفظ مکمل سنا دینے والے 12 طلبہ کو بھی انعام دیا گیا۔ عربی درجات میں امتیازی نمبر لانے والے 13 طلبہ کو بھی انعام دیا گیا۔ اس موقع پر عربی زبان میں ڈپلوما کرنے والے 21 طلبہ کو سرٹیفکیٹ سے نوازا گیا۔ جامعہ رحمانی میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کے تعاون سے نوجوانوں کو عربی زبان سکھائی جاتی ہے اور سرٹیفکیٹ دیا جاتا ہے۔ تمام طلبہ کو انعامات نقد روپے کی شکل میں دیے گئے۔ اس موقع پر محمد ارشد رحمانی اور محمد شارب ضیا رحمانی متعلمین جامعہ رحمانی مونگیر کی تقریریں بھی نمونے کے طور پر ہوئیں جس سے سامعین کو جامعہ رحمانی کے طلبہ کی تقریری صلاحیت کا بخوبی اندازہ ہوا۔

(اخبار مشرق، دہلی)

اردو کا مقابلہ کوئی زبان نہیں کرسکتی

● بھوپال۔ اردو نہ مظلوم ہے نہ فریادی۔ یہ جس تیزی سے پھیل رہی ہے، آگے بڑھ رہی ہے اس کا مقابلہ کوئی دوسری زبان نہیں کرسکتی۔ یہ آج افریقہ کے جنگلات سے لے کر عرب کے صحراؤں تک، یورپ اور امریکہ سے لے کر آسٹریلیا تک وسعت اختیار کرچکی ہے اور داغ کا یہ مصرعہ ''ہندوستاں میں دھوم ہماری زباں کی ہے'' اب سارے جہاں میں دھوم ہماری زباں کی ہے'' بن چکا ہے۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے وائس چیرمین، شاعر اور صحافی چندر بھان خیال نے مذکورہ خیالات کا اظہار مدھیہ پردیش اردو اکادمی کے زیر اہتمام قومی کونسل کے کمپیوٹر سینٹر کے طلبا کو تقسیم اسناد کے موقع پر بحیثیت مہمان خصوصی کے بولتے ہوئے کیا۔ انھوں نے مزید کہا کہ اردو زبان پھیل رہی ہے مگر اس کا

رسم الخط سکڑ رہا ہے یہ سب سے اہم مسئلہ ہے۔ انھوں نے سوال کیا کہ اردو والے اردو کے لیے کیا کر رہے ہیں؟ وہ اپنی ذمہ داری سمجھتے ہوئے کیا اپنے بچوں کو اردو پڑھا رہے ہیں، انھوں نے آگے کہا کہ ملک میں بہت سے لوگ اردو سیکھنا چاہتے ہیں۔ مسئلہ وسائل اور ذرائع کا ہے، اس کے لیے قومی کونسل نے تمام اضلاع میں اردو سکھانے کے اردو سینٹر قائم کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔

اردو اکادمی کے چیرمین ڈاکٹر بشیر بدر نے پروگرام کی صدارت کی۔ پروگرام کے انعقاد میں صدائے اردو اور کاروان ادب بھی شریک تھے۔ ابتدا میں جاوید یزدانی نے مومنٹو اور سپاس نامہ پیش کیا اور پڑھ کر سنایا۔ نعیم کوثر نے کونسل کی سرگرمیوں کے سلسلے میں صائب مشورے بھی دیے۔ کوثر صدیقی نے چندر بھان خیال کی شخصیت اور شاعری پر ایک مقالہ پڑھا جبکہ ڈاکٹر شاہد میر نے بھوپال پر اپنی مشہور نظم سنا کر ماحول کو خوشگوار بنایا۔

اردو اکادمی کی سکریٹری نصرت مہدی نے کمپیوٹر سینٹر کی رپورٹ پیش کی اور اردو سکھانے کا سینٹر اکادمی میں قائم کیے جانے کا مطالبہ بھی کیا۔ بائی (ہوشنگ آباد) کے رہنے والے چندر بھان خیال قومی کونسل میں وائس چیرمین کا عہدہ سنبھالنے کے بعد پہلی بار بھوپال تشریف لائے تھے اکادمی نے اس موقع پر ان کو اکادمی کی مطبوعات کا ایک سیٹ نذر کیا اور شال اور پھولوں سے استقبال کیا۔

تعلیمی سال 2006\07 میں کمپیوٹر سینٹر کے کامیاب طلبہ جن مین سے زیادہ تر روزگار حاصل کر چکے ہیں، ان میں ندا خاں وفرح خاں نے سب سے زیادہ نمبر حاصل کر کے اول مقام پایا۔ دوسرے درجے میں عرشیہ فاطمہ اور شگفتہ پروین رہیں۔ برج موہن گپتا، نورین صبا، دیوندر کمار اور کمل برمن نے بھی نمایاں نمبروں سے کامیابی حاصل کی۔ ان سب کو چندر بھان خیال نے اسناد تقسیم کیں۔ اس موقع پر انھوں نے اپنی نظمیں بھی سنائیں۔ پروگرام کے صدر ڈاکٹر بشیر بدر نے اپنی تقریر کے دوران اعتراف کیا کہ چندر بھان خیال کی نظمیں، زبان، بیان اور فکر کے لحاظ سے طاقتور اور خوبصورت ہیں۔ انھوں نے کامیاب طلبہ کو مبارک باد دی اور امید ظاہر کی کہ وہ اسی طرح ہر میدان میں آگے بڑھیں گے اور اپنی زبان، ملک اور شہر کا نام روشن کریں گے۔ انھوں نے کمپیوٹر سینٹر کے حسن مصطفیٰ، اعظم حسین اور دلشاد حسین کی تعریف کی کہ ان کی محنت اور لگن سے اکادمی سینٹر کے طلبہ کا صد فی صد رزلٹ نکلا۔ (ڈاک سے)

مختصر خبریں

● میوات۔ 29 مئی، ریاست کے سب سے پچھڑے علاقے میوات کے درجنوں سرپنچوں، سماجی کارکنوں سماجی تنظیموں نے ہریانہ سرکار سے میوات ضلع میں اردو میڈیا سیل کی تشکیل کی مانگ کی ہے اور کہا ہے کہ علاقہ میں اردو پڑھنے والوں کی کافی تعداد کو دیکھتے ہوئے اردو اخبارات میں چھپنے والے مسائل پر حکومت غور وفکر کرے۔ آل انڈیا میو سبھا کے جنرل سکریٹری رشید احمد میو نے کہا کہ میوات کی 12 لاکھ کی آبادی میں تقریباً 8 لاکھ کی آبادی اردو کی ہے۔ اس خطے میں آباد میو قوم کے لوگ اپنے بچوں کو اردو عربی کی تعلیم سے آراستہ کرنے کے لیے مدرسوں اور مسجدوں کے اساتذہ کے پاس بھیجتے ہیں۔ غور طلب یہ ہے کہ پہلے میوات کے تقریباً سبھی مڈل اور ہائی اسکولوں میں اردو طلبہ کو پڑھائی جاتی تھی اور اردو کے اساتذہ بھی تھے لیکن انتظامیہ اور حکومت کے متعصبانہ رویے کے چلتے اب میوات کے صرف دو یا تین اسکولوں میں اردو کے ٹیچر موجود ہیں جس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ انتظامیہ اور سرکار کی اندیکھی سے زندگی کے ہر شعبے میں اہم رول ادا کرنے والی اردو زبان اپنا وجود کھوتی جا رہی ہے اور آج یہ صرف مدرسوں اور مسجدوں تک ہی سمٹ کر رہ گئی ہے۔ انھوں نے اسے سرکار کی اردو زبان کے تئیں ناانصافی قرار دیتے ہوئے کہا کہ سرکار میوات کے علاقے میں اردو کے فروغ کا بہتر انتظام کرے۔ وہیں میوات کے مشہور سماجی کارکن اور سابق سرپنچ فخر الدین دوہا، سابق پٹواری متھن لال، ابراہیم بگولا، رکن ہریانہ حج کمیٹی قاسم آزاد، آل میوات دکاس پریشد کے چیئرمین زبیر انوری، وغیرہ نے کہا کہ انتظامیہ کے اعلیٰ افسران کو اردو زبان کا علم نہ ہونے کی وجہ سے اردو اخبارات میں شائع خبروں کا پتہ نہیں چل پاتا اور اردو سرکاری طور پر اپنا وجود کھوتی جا رہی ہے۔ ادھر میوات کے کافی لوگوں نے ہریانہ اردو اکادمی پر الزام عائد کرتے ہوئے کہا کہ ریاست میں اردو اکادمی صرف اردو کے فروغ کے نام پر ایک دکھاوا ہے اور میواتیوں نے اردو اکادمی کے کاموں کی تفصیلی رپورٹ عوام کے سامنے پیش کرنے کی مانگ کی ہے۔ کئی تنظیموں نے کہا کہ میوات میں اردو کے فروغ کے لیے ایسا کوئی کام زمینی سطح پر انجام نہیں دیا گیا ہے کہ یہ کہا جا سکے کہ میوات میں اردو کے فروغ کا کوئی کام چل رہا ہے۔ آل انڈیا مسلم میو دکاس پریشد کے قومی ترجمان رحیم الدین خاں رحیم نے سرکار سے پرزور مطالبہ کیا ہے کہ میوات ضلع میں اردو زبان کے منھے وجود کو بچانے کے لیے سرکاری اسکولوں میں اردو اساتذہ کی پوسٹ سیکشن کی جائیں اور ہریانہ اردو اکادمی کے لاکھوں کروڑوں کے بجٹ کو زمینی سطح پر خرچ کیا جائے تاکہ عام آدمی مستفید ہوں اور اردو اخباروں میں شائع مسائل کو حل کرنے کے لیے ضلع اور صوبائی سطح پر اردو میڈیا سیل تشکیل کی جائے۔

(ہمارا سماج، نئی دہلی)

● مدھے پور۔ 23 مئی، 27 برس کا طویل عرصہ گزر گیا، اردو دوسری سرکاری زبان کی حیثیت سے زمین پر نہیں اتر سکی۔ دفاتر میں کہیں بھی اس کا وجود

نہیں ہے۔ جو مترجم بحال ہوئے تھے وہ بھی سبکدوش ہوتے جارہے ہیں۔ نئی بحالی نہیں ہورہی ہے۔ سائن بورڈوں پر جو تھوڑی بہت اردو باقی تھی وہ بھی آہستہ آہستہ غائب ہوتی جارہی ہے۔ ان خیالات کا اظہار تخلیقی ہائسل مدھے پورہ کے سپرنٹنڈنٹ پروفیسر تبارک کیا۔ انھوں نے کہا کہ اردو کے عملی نفاذ کے لیے سرکاری افسران کے نام کی تختی، سائن بورڈس اردو میں لکھے ہونے چاہیے۔ اردو میں دی گئی درخواست قبول کی جانی چاہیے۔ مختلف محکموں سے نکلنے والے اشتہارات بھی اردو میں ہونے چاہیے۔ اسی طرح گاڑی کے پلیٹ نمبر اور سنگ میل پر بھی اردو کو جگہ ملنی چاہیے۔ ضلع گزٹ ہندی کے ساتھ اردو میں بھی ہونے چاہیے لیکن ایسا نہیں ہورہا ہے۔ جو نہ صرف اردو والوں کے ساتھ سوتیلا سلوک ہے بلکہ قانون کی بھی خلاف ورزی ہے۔ کون ہے جو اس کے لیے آواز بلند کرے؟ غیر اردو داں افسران اردو کو مسلمانوں کی زبان سمجھتے ہیں۔ اردو کی بدحالی میں جہاں غیروں کے تعصب کا عمل دخل ہے وہیں اپنوں کی بے حسی بھی کم نہیں۔ اردو داں حضرات خود اپنے سائن بورڈ، شادی کارڈ اور دیگر کام ہندی میں کرتے ہیں۔ اردو جاننے کے باوجود وہ ہندی کے اخبارات خرید کر پڑھتے ہیں۔ جبکہ اردو میں بھی وہ سارا مواد اور ساری خبریں انھیں مل جاتی ہیں پھر بھی اپنے بچوں کو اردو سکھانا غیر ضروری سمجھتے ہیں۔ یقین جانیے مادری زبان کی بے قدری ماں کی بے عزتی کے مترادف ہے۔ جس دن اردو زبان سرکاری دفاتر کے سائن بورڈ اور سڑکوں پر لگے سنگ میل پر نظر آئے گی سمجھ لیجیے کہ اردو کو اس کا حق مل رہا ہے۔ مدھے پورہ شہر گھوم کر دیکھ لیجیے بڑے بڑے اشتہارات اور ہورڈنگ سے شہر اٹا پڑا ہے لیکن اردو کا کوئی نام و نشان نہیں۔ کہیں کہیں اس کا وجود مل جاتا ہے۔ سیاسی لیڈران جب کوئی پروگرام کرتے ہیں ان کا بینر بھی اردو سے خالی رہتا ہے۔ ظاہر سی بات ہے جب اردو کا عملی نفاذ نہیں ہوگا تو اردو داں کو سرکاری ملازمت کیسے ملے گی۔ اس طرف سنجیدگی سے غور کرنے کی ضرورت ہے اور عملی طور پر اقدام کرنے کی ضرورت ہے۔ اس سلسلے میں یہاں مدھے پورہ میں کچھ جوانوں نے تحریک چھیڑی ہے۔

(راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

● نئی دہلی۔ 27 مئی، دہلی اردو اکادمی میں آج سہ روزہ اردو خواندگی مرکز کے لیے ٹیچر ٹریننگ کا افتتاح کیا گیا۔ اس موقع پر مرغوب حیدر عابدی سکریٹری اردو اکادمی نے تعلیم کی افادیت پر روشنی ڈالی اور اردو خواندگی مرکز میں تعلیم حاصل کرنے والے طلبہ کی بہتر کارکردگی کی امید ظاہر کی اور کہا کہ آج جو 30 نئے انسٹرکٹر ہوئے ہیں وہ اپنی بھرپور خدمات انجام دیں گے۔ اس ٹریننگ میں سینئر کوآرڈی نیٹر شہزاد حسین انسٹیٹ ریسورس سینٹر جامعہ ملیہ اسلامیہ نے آج صبح 10 بجے سے شام 5 بجے تک سہ روزہ ٹریننگ میں موجود نئی انسٹرکٹر لڑکیوں کو تعلیمی نظام اور بچوں کے ساتھ بہتر تعلیمی نظام کو عام کرنے اور تعلیم سے متعلق رموز کو سمجھایا۔ اس موقع پر پروجیکٹ آفیسر زاہد حسین نے بھی مشورے دیے تاکہ مرکز کو کامیاب بنایا جاسکے۔ یاد رہے کہ اس سال اکادمی نے دہلی اور بیرون دہلی کے علاقوں میں تقریباً 160 سینٹر قائم کیے ہیں جن میں الگ سے 25 سینٹر NGO کے ماتحت ہیں۔ اکادمی ہر ماہ ناخواندہ افراد کو پڑھانے کے لیے انسٹرکٹر کو 1500، 1000، 1200 روپے ادا کرے گی۔

(صحافت، نئی دہلی)

● آگرہ۔ 23 مئی، اردو ٹیچر ویلفیئر ایسوسی ایشن نے مطالبہ کیا ہے کہ اتر پردیش میں اردو اساتذہ کے خالی عہدوں کو دوبارہ بھرا جائے۔ ایسوسی ایشن کے صوبائی کنوینر صابر خاں نے کہا کہ اتر پردیش کے پرائمری اور جونیئر ہائی اسکولوں میں اردو ٹیچرز کی تقریباً 10 ہزار آسامیاں خالی پڑی ہیں۔ انھوں نے کہا کہ 1999 کے بعد جن اساتذہ کی تقرری کی گئی تھی وہ ترقی پاکر پرنسپل ہوگئے ہیں۔ لہٰذا ان کے خالی عہدہ کو دوبارہ بھرا جائے۔ انھوں نے اتر پردیش کی مایاوتی حکومت سے عوامی مفاد میں جلد اردو اساتذہ کی تقرری کا مطالبہ کرتے ہوئے کہا کہ حکومت آئندہ سال تقریباً 80 ہزار ٹیچرز کا تقرر کرنے جارہی ہے۔ یہ ایک خوش آئند قدم ہے لیکن اس میں اردو ٹیچرز کی وہ خالی اسامیاں بھی شامل ہیں، جن کو الگ سے دکھایا جانا ضروری تھا۔ انھوں نے مطالبہ کیا کہ جامعہ اردو علی گڑھ، آل انڈیا اردو تعلیم گھر لکھنؤ اور اردو کے دیگر امتحانات کو تسلیم کیا جائے۔ یوپی اردو ٹیچرز ویلفیئر ایسوسی ایشن کے صدر سید تشہیب زیدی اور جنرل سکریٹری عقیل اختر ملک نے کہا کہ حکومت اردو کے بارے میں جتنے بہتر فیصلے کرتی ہے انتظامیہ ان سب کو نظر انداز کردیتی ہے۔ بیشتر اردو اساتذہ کے سالانہ انکریمنٹ، پروموشن اور بے اسکیل کے مسائل حل کرنے کے لیے افسران کو زیادہ تندہی سے کام کرنے کی ضرورت ہے۔

(راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

● حیدرآباد۔ 19 مئی، سکریٹری جنرل انڈین یونین آف جرنلسٹس کے سرینواس ریڈی نے حیدرآباد میں اردو صحافت کے شاندار کارناموں کی ستائش کرتے ہوئے کہا کہ مستقبل بھی شاندار رہے گا۔ انھوں نے کہا کہ شہر حیدرآباد میں لسانی امتیاز کے بغیر مجموعی طور پر ہر زبان بالخصوص اردو صحافت کی بقا اور فروغ کے لیے کوششیں ہوتی رہی ہیں۔ اس سلسلے میں پریس اکادمی اور اردو اکادمی کے تعاون و اشتراک سے آندھرا پردیش یونین آف جرنلسٹس اردو صحافیوں کی پیشہ ورانہ تربیت کے علاوہ ان کے حقوق اور دیگر مسائل کو حل کروانے میں نمایاں رول ادا کررہی ہے۔ وہ اے۔ پی۔ یونین جرنلسٹس کے زیر اہتمام آندھرا پردیش پریس اکادمی اور اے۔ پی۔ اردو اکادمی کے مشترکہ

تعاون سے اردو صحافیوں کے لیے کمپیوٹر تربیتی کلاسز کی افتتاحی تقریب سے خطاب کررہے تھے۔ ڈی امر صدر نشین پریس اکادمی نے تقریب کی صدارت کی۔ علی ظہیر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، جنوبی ہند نے شمع روشن کرکے رسمی افتتاح انجام دیا۔ سرینواس ریڈی نے کہا کہ اردو کمپیوٹر کی تربیت سے صحافیوں کو اپنے فرائض اور پیشہ ورانہ سرگرمیوں کو کمپیوٹرائز کرنے اور بہتر انداز میں خبروں کی ترسیل میں مدد ملے گی۔ ڈی امر صدر نشین پریس اکادمی نے اپنے صدارتی خطاب میں کہا کہ ریاست آندھرا پردیش میں بالخصوص حیدرآباد میں مختلف زبانوں کے صحافیوں میں تال میل کی بدولت اخبارات اور ان سے وابستہ صحافیوں میں خوشگوار تعلقات رہے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ حیدرآباد کی صحافی برادری نے کبھی بھی لسانی امتیاز سے کام نہیں لیا جو بڑی خوش آئند علامت ہے۔ صدر نشین پریس اکادمی نے ذرائع ابلاغ کی ضرورتوں اور تقاضوں کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا کہ مستقبل میں بھی اس طرح کے پروگراموں میں اکادمی کا تعاون حاصل رہے گا۔ تقریب کے مہمان خصوصی مشیر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان برائے جنوبی ہند علی ظہیر نے اردو زبان میں کمپیوٹر سافٹ ویئر کی تیاری کو وقت کی اہم ضرورت قرار دیتے ہوئے کہا کہ اردو صحافت میں غلطیوں کے سدباب کے لیے نیا سافٹ ویئر ناگزیر ہے۔ اسی سلسلے میں ڈکشنری پر مشتمل اردو سافٹ ویئر کی تیاری پر کام ہورہا ہے۔ انھوں نے کہا کہ نئے سافٹ ویئر کی مدد سے غلط ٹائپنگ کی اصلاح ممکن ہوسکے گی۔ صدر نشین اردو اکادمی رحیم الدین انصاری نے پریس اکادمی کی جانب سے آندھرا پردیش یونین آف ورکنگ جرنلسٹس کے اشتراک سے صحافیوں کے لیے کمپیوٹر تربیت کی فراہمی پر اظہار مسرت کرتے ہوئے اعلان کیا کہ اس کورس میں امتیازی نمبر حاصل کرنے والے صحافیوں کو اردو اکادمی کی جانب سے کمپیوٹر مفت فراہم کیا جائے گا۔ انھوں نے پریس اکادمی کو بھی چار کمپیوٹر فراہم کرنے کا اعلان کیا۔ ڈائرکٹر حسامی کمپیوٹر انسٹی ٹیوٹ حسام الدین ثانی نے تربیتی پروگرام کی تفصیلات سے واقف کروایا۔ محترمہ سوماسندر صدر، نریندر ریڈی جنرل سکریٹری اے پی یو ڈبلو جے اور ایم اے ماجد نے بھی اظہار خیال کیا۔ محمد ریاض احمد سکریٹری اے پی یو ڈبلیو نے تمام حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔

(منصف، حیدرآباد)

● نئی دہلی۔ 22 مئی، دہلی میں وزارت تعلیم 28 زونوں کے تمام اسکولوں کو سرکلر جاری کررہی ہے کہ جس اسکول میں بھی اردو پڑھنے والے بچے ہوں اس میں اردو اساتذہ کی تقرری کرکے انھیں اردو پڑھنے کا موقع فراہم کیا جائے۔ یہ بات دہلی کے وزیر تعلیم اروندر سنگھ لولی نے شاہ شرافت علی میاں کے جشن کی تقریب کی پہلی نشست میں کہی وہ اس تقریب میں بطور مہمان خصوصی شریک تھے۔ تقریب کا اہتمام حضرت شاہ فقیین اکادمی آف انڈیا کے دہلی یونٹ نے سیلم پور کی تاج کالونی میں کیا تھا۔ وزیر تعلیم نے مزید کہا کہ مدارس اسلامیہ کے بچوں کو کمپیوٹر کی تعلیم سے جوڑنے کے لیے جو بھی اہلکار رجسٹرڈ مدرسہ وزارت تعلیم سے کمپیوٹر کا مطالبہ کرے گا وہاں کمپیوٹر لگائے جائیں گے۔ وزیر برائے ٹرانسپورٹ ہارون یوسف نے کہا کہ اس جدید ٹیکنالوجی کے دور میں دینی تعلیم کے ساتھ عصری تعلیم حاصل کرنا نہایت ضروری ہے۔

انھوں نے کہا کہ جس تیزی سے ترقی ہورہی ہے اس میں شامل ہونے کے لیے جدید تعلیم خود راستہ بتادیتی ہے۔ ڈاکٹر پرویز میاں نے بزرگان دین کے بتائے ہوئے راستوں پر چلنے کی تلقین کی اور فقیین اکادمی کے اہل یونٹ کی ستائش کی۔ چوہان باگمر کی کونسلر رضیہ سلطانہ، گاندھی نگر کی کونسلر ارندر شرما، حاجی قیصر آزاد و دیگر معززین نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ اس تقریب میں حضرت شاہ فقیین اکادمی یونٹ دہلی کی طرف سے 51 مستحق خواتین میں سلائی مشینیں تقسیم کی گئیں۔ بعد ازاں دوسری نشست کا آغاز محمد فقیین میاں (بریلی شریف) کی سرپرستی اور شاہی مسجد فتح پوری کے امام وخطیب مولانا مفتی ڈاکٹر محمد مکرم احمد کی صدارت میں ہوا۔ اس موقع پر سید شاہ احمد مکی راشد اشرفی جیلانی (کچھوچھہ شریف) نے خطاب کیا۔ آخر میں اکادمی کے صدر حاجی ممتاز علی نے اغراض و مقاصد بتاتے ہوئے سب کا شکریہ ادا کیا۔ اس تقریب میں راغب ٹکرالوی کے شعری مجموعہ کا اجرا بھی عمل میں آیا۔ (راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

● سنبھل۔ شہر کے معروف مصنف و شاعر ڈاکٹر رضاء الرحمٰن عاکف سنبھلی کو 2007 میں شائع شدہ ان کی کتاب ''روہیلکھنڈ کی سیاسی، ثقافتی اور ادبی تاریخ'' پر اتر پردیش اردو اکادمی نے انعام سے نوازا ہے۔ ڈاکٹر عاکف سنبھلی متعدد کتب کے مصنف ہیں اور ان کے مضامین اور نظمیں، غزلیں اخبارات و جرائد میں شائع ہوتی رہتی ہیں۔ ان کے پی ایچ ڈی کے مقالے ''روہیلکھنڈ کے نثری ادب پر مولانا احمد رضا خاں کی خدمات'' پر ادارہ تحقیقات امام احمد رضا کراچی، پاکستان سے 2005 میں گولڈ میڈل مل چکا ہے۔

● رانچی۔ 22 مئی، انجمن ترقی اردو جھارکھنڈ نے حکومت سے مطالبہ کیا ہے کہ اردو زبان میں حصول تعلیم کو یقینی بنانے کے لیے سہ لسانی فارمولے کو فی الفور نافذ کرے۔ میڈیا انچارج انجمن ترقی اردو جھارکھنڈ محمد غوث ابن رشید نے اپنے پریس بیان میں کہا ہے کہ اردو زبان کے فروغ اور بقا کے لیے جھارکھنڈ کی حساس اردو آبادی اپنی جدوجہد جاری رکھے ہوئے ہے۔ انھوں نے کہا کہ ہندوستان کی مشترکہ تہذیب کی علامت اردو سے والہانہ عشق اور عقیدت رکھنے والے طبقات اردو کو مادری زبان کی حیثیت سے درسی نصاب میں لازمی مضمون کے طور پر شامل کرنے کا پرزور مطالبہ کرتے ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ جب این

ڈی اے نے 2000 میں اقتدار اعلیٰ اپنے ہاتھوں میں لیا تو اردو دشمن پالیسی کو اپناتے ہوئے اردو کو لازمی مضمون کی حیثیت سے اسکولی نصاب سے خارج کردیا۔ انجمن ترقی اردو نے این ڈی اے کی اردو کش روش کے خلاف آئینی اور قانونی نکات کو سامنے رکھتے ہوئے اس وقت کے وزیر اعلیٰ بابولال مرانڈی، ارجن منڈا اور اور وزیر تعلیم کو میمورنڈم سونپا اور اردو کو لازمی مضمون کی حیثیت سے برقرار رکھنے کا پرزور مطالبہ کیا۔ (راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

مشاعرے

● نئی دہلی۔22 کناڈا، میں مقیم شاعر وادیب اور جوش لٹریری سوسائٹی کے صدر اقبال حیدر کے استقبال میں ایک مخصوص شعری نشست کا انعقاد غالب انسٹی ٹیوٹ اور اردو اکادمی کے باہمی اشتراک سے کیا گیا، جس میں دہلی کے ممتاز معاصر شعرا نے شرکت کی۔ نشست کی صدارت اردو اکادمی کے وائس چیئر مین پروفیسر قمر رئیس اور نظامت پروفیسر علی احمد فاطمی نے کی۔ جن شعرا نے اپنی نظموں اور غزلوں سے سامعین کو محظوظ کیا۔ ان کے نام مندرجہ ذیل ہیں:

قمر رئیس، اقبال حیدر، محمود سعیدی، زبیر رضوی، شجاع خاور، عتیق اللہ، شاہد ماہلی، شہپر رسول، فرحت احساس اور بلراج کومل آخر میں اردو اکادمی کے سکریٹری سید مرغوب حیدر عابدی نے مہمانوں اور حاضرین کا شکریہ ادا کرتے ہوئے نشست کی کامیابی پر اطمینان اور طمانیت کا اظہار کیا۔ اس موقع پر خاطر خواہ تعداد میں سرکردہ شخصیات کے علاوہ اردو اکادمی اور غالب انسٹی ٹیوٹ کا عملہ موجود تھا۔ حاضرین میں قاضی عبید الرحمٰن ہاشمی، محمود نقوی، عزیز قریشی، ابن کنول، انیس مرزا، عظیم صدیقی، خالد علوی، عقیل احمد، متین امروہوی، اسرار جامعی، شاہینہ تبسم، نگار عظیم، وسیم راشد، بیگم اقبال حیدر، کمال حیدر، سلیم امروہوی، رؤف راشد، راشد عزیز، سید راغب الدین، انیس اعظمی وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔

● نئی دہلی۔ 5 جون، آل انڈیا رفاہ عام فاؤنڈیشن کے زیر اہتمام اردو کے معروف شاعر شمس رمزی کے اعزاز میں ایک محفل شعر وسخن کا انعقاد کیا گیا جس کی صدارت پروفیسر محمد نعمان خاں صدر شعبۂ عربی دہلی یونیورسٹی نے کی۔ مہمان خصوصی کے طور پر پروفیسر ملک زادہ منظور احمد اور جسٹس تنویر وصفی نے شرکت کی۔ ابتدائی تقریب میں تلامذۂ شمس رمزی نے شمس رمزی کو دستار فضیلت باندھی اس کے بعد فاؤنڈیشن کی جانب سے شیلڈ اور توصیلی سند پیش کی گئی پروفیسر ملک زادہ منظور احمد نے اپنی تقریر میں کہا کہ شمس رمزی نئی نسل کے معتبر اور ممتاز فنکاروں میں سے ایک ہیں انھوں نے کہا کہ فنون لطیفہ میں موسیقی، رقص اور بہت سی چیزوں کو رکھا جاسکتا ہے لیکن شاعری کو جو اولیت اور افضلیت حاصل ہے وہ کسی کو نہیں انھوں نے کہا کہ تاج محل جس وقت بنا تھا بہت خوبصورت تھا لیکن آج اتنا نہیں ہے اور ہوسکتا ہے ہزار اور ہزار سال بعد تاج محل ختم ہوجائے انھوں نے کہا کہ ہر چیز تبدیل ہوتی ہے جغرافیہ بدلتا ہے مگر سچا فنکار ہمیشہ اسی آب وتاب سے زندہ رہتا ہے بلکہ اس کے دنیا سے چلے جانے کے بعد بھی اس کے فن کو مختلف طرح سے پرکھا جاتا ہے۔ شمس رمزی بھی نئی نسل کے ان فنکاروں میں ہیں جنھوں نے نئی نسل کو اپنے کلام اور تنقید سے متاثر کیا ہے۔ ملک زادہ جاوید نے پروگرام کی نظامت کرتے ہوئے کہا کہ شمس رمزی دور حاضر میں نئی نسل کے ان فنکاروں میں ہیں جنہیں شاعری، تنقید، تحقیق اور عروض جیسے فن پر عبور حاصل ہے۔ بعد ازاں محفل شعر وسخن کا آغاز ہوا۔ جن شعرا کے کلام کو بے حد پسند کیا گیا ان کے نام حسب ذیل ہیں:

پروفیسر ملک زادہ منظور احمد، تنویر وصفی، شہباز ندیم ضیائی، ملک زادہ جاوید، عمران عظیم، علی رضا عدیل سالکھنوی، شعیب مرزا، راحت مظاہری، شاذ رمزی، مختار الہ آبادی، راشد عزیز، وارث وارثی اور شمس رمزی۔

(ہمارا سماج، نئی دہلی)

● نئی دہلی۔ 2 جون، اراکین امام زین العابدین میموریل سوسائٹی کی جانب سے غالب اکیڈمی بستی حضرت نظام الدین نئی دہلی میں جشن ولادت سید الساجدین کا انعقاد کیا گیا جس کی صدارت سید ندیم عباس زیدی نے کی۔ جبکہ نظامت اردو اکادمی کے جنرل سکریٹری سید مرغوب حیدر عابدی نے کی۔ اس محفل میں مہمان خصوصی کے طور پر جوائنٹ کمشنر ٹریفک پولس، قمر احمد اور اردو اکادمی کے سابق سکریٹری سید شریف الحسن نقوی نے شرکت کی۔

سید مرغوب حیدر عابدی، ریاض نوگانوی، متین امروہوی، راقم نوگانوی، سرتاج عالم عابدی، اختر نوگانوی وغیرہ نے منظوم نذرانہ عقیدت پیش کرکے سامعین کو خوب محظوظ کیا۔ نظم کے علاوہ نثر میں بھی دانشوروں نے فن کے جوہر دکھائے اور امام سید سجاد کی زندگی اور فضائل سے محفل کو رونق بخشی۔ خواجہ حسن ثانی نظامی سجادہ نشین درگاہ عالیہ نظام الدین اور مولانا جاوید عباس قمر احمد اور شریف الحسن نقوی نے اپنی تقریر سے نورانی محفل کو چار چاند لگائے۔ یہ پروگرام شام پانچ سے رات نو بجے تک چلا۔ تقریباً تین سو حضرات نے شرکت کی ان کے علاوہ مستورات بھی محفل میں آخر تک موجود رہیں۔

(ہمارا سماج، نئی دہلی)

● رامپور۔ 8 جون، ہندوستان کے مشہور ومعروف شعرا رئیس رامپوری اور مرتضیٰ فرحت کی یاد میں بعنوان یاد رفتگاں وفا ایجوکیشنل سوسائٹی کے زیر اہتمام ہادیہ پبلک اسکول میں کامیاب مشاعرہ منعقد کیا گیا۔ مشاعرے کی

صدارت ڈاکٹر حسن احمد نظامی گورنمنٹ رضا پوسٹ گریجویٹ کالج نے فرمائی۔ جبکہ مہمان خصوصی کی حیثیت سے الحاج محمد قمر خاں مصنف ومحقق تشریف فرما تھے۔ مشاعرے کے کنوینر آل احمد خاں تھے اور مشاعرے کی نظامت نامور شاعر افتخار طاہر نے بخوبی انجام دی۔ اس کے بعد مہمان خصوصی اور صاحب صدر اردو کے دو ممتاز شعرا رئیس رامپوری اور مرتضیٰ فرحت کی حیات وخدمات پر بھر پور روشنی ڈالی۔ مشاعرے میں جن شعرا کو بے حد پسند کیا گیا ان کے نام حسب ذیل ہیں:

شاذیہ بہار، پرچم امروہوی، ڈاکٹر اشفاق زیدی، منظر سیفی، عتیق جیلانی سالک، فراست علی فراست، گلشفاں گل، اختر چچا بلاغ، غفران فریدی، ڈاکٹر ظہیر رحمتی، نعیم نجمی، سید پرویز نظامی، فرید شمسی، مکارم الحق مکارم، سعید راشن،

مشاعرہ میں شریف الرحمٰن خاں، نوید رئیس، ندیم فرحت، عظیم فرحت، پرویز نظامی، ساجد سیوی، مکرم حسین صدیقی، مخدوم خاں ٹھیکیدار، نقی الدین احمد، عطاء الرحمٰن گڈو، دلن خاں بھارت کے علاوہ کافی تعداد میں مرد وخواتین نے شرکت کی، مشاعرہ صبح 4 کامیابی کے ساتھ انجام کو پہنچا۔

(صحافت، نئی دہلی)

● نئی دہلی۔ 4 جون، تعمیر ملت فاؤنڈیشن کے زیر اہتمام حوض رانی میں ایک ادبی نشست منعقد کی گئی، جس میں بحیثیت مہمان خصوصی حکیم ظہور الحسن نے شرکت کی۔ اس ادبی نشست کی صدارت ڈاکٹر فریاد آزر اور نظامت حبیب سیفی نے کی۔ نشست میں حوض رانی علاقہ کے محلّہ جہاں پناہ میں ایک اردو لائبریری کھولنے کی خبر کے تعلق سے بھی گفتگو کی گئی۔ جس کے لیے سیاسی وسماجی کارکن مرزا ذکی بیگ احمد کافی کوششوں میں لگے ہوئے ہیں۔ رسمی افتتاحی تقریب کے بعد اس لائبریری کو عوام کے حوالے کردیا جائے گا اور نگرانی کی ذمے داری عبید الرحمٰن عبید کو سونپی جائے گی۔ اس نشست میں مقامی شاعروں کے علاوہ دہلی سے باہر کے بھی کئی شعرا نے اپنے کلام سے نوازا۔ جن شعرائے کرام نے اس نشست میں اشعار پیش کیے ان کے نام اس طرح ہیں:

ڈاکٹر فریاد آزر، حافظ زاہد امروہوی، عارف حسین افسر، مجیب اعزاز، دانش میرٹھی، عارف سیفی، محمد اسلام پٹھان، سلیماں فراز، حبیب سیفی، عادل بلند شہری، احمد حسن سیانوی، مدثر عالم حسن پوری اور سید ناصر۔

تعمیر ملت فاؤنڈیشن کی اس ادبی نشست میں کثیر تعداد میں اہل ذوق نے شرکت کی۔ جن میں خصوصی طور پر بشیر بھائی، افضال احمد، محمد عارف، محمد عادل، شہاب الدین، جمیل مظہر اور احسان دانش کے نام قابل ذکر ہیں آخر میں نشست کے کنوینر مرزا ذکی احمد بیگ نے تمام شرکا کا شکریہ ادا کیا۔

(ہمارا سماج، نئی دہلی)

● گوپال گنج، 3 رجون گوپال گنج ضلع کے بھوساؤں گاؤں میں گذشتہ شام شری دینا ناتھ شریواستو کی قیام گاہ پر ہندی اور اردو کے اہل علم کی ایک خصوصی نشست ہوئی جس کی صدارت انجمن ترقی اردو گوپال گنج کے سکریٹری جناب ذاکر حسین ذکی ہاشمی نے کی۔ نشست سے پہلے اردو اور ہندی کے لسانی رشتوں پر گفتگو ہوئی شری انیل کمار سنگھ نے بتایا کہ ہندی زبان بغیر اردو کے ادھوری ہے اور اردو مسلمانوں کی زبان نہیں بلکہ پورے ہندوستانیوں کی زبان ہے بلکہ پورے ہندوستانیوں کی زبان ہے۔ جناب ذکی ہاشمی نے فرمایا اردو ہندوستان میں پیدا ہوئی، یہاں کے ہندوؤں اور مسلمانوں کے آغوش میں پلی اور جوان ہوئی۔ اس زبان نے ہندوستانی تہذیب کو نئی روشنی عطا کی اسے کسی ایک قوم کی زبان کہنا گنگا جمنی تہذیب کو مجروح کرنا ہے۔

شعری نشست کی نظامت یوگیش چندر انجم نے کی اور جن شعرا نے اپنا کلام پیش کیا ان کے نام ہیں:

ذکی ہاشمی، آنند جھا آنند، غلام حسین غلام، یوگیش چندر انجم، سبحان علی اور سنتوش کمار۔

(قومی تنظیم، دہلی)

● نوئیڈا۔ 21 جون، کل صبا اپارٹمنٹ سیکٹر 14 پر رفعت سروش کے مکان پر اردو فاؤنڈیشن کا جلسہ زیر صدارت بی ایس جین جوہر منعقد ہوا۔ ابتدا میں صوفی پیارے میاں عزیزی نے جناب ابرار کرت پوری کی نعتیہ رباعیوں کے مجموعہ ''عقیدت پارے'' کا اجرا کیا۔ بعد ازاں شعری دور کا آغاز ہوا، جس کی نظامت میزبان رفعت سروش نے کی۔

اس نشست میں جن شعرا نے شرکت کی ان کے نام اس طرح ہیں:

ملک زادہ جاوید، مولا بخش اسیر، محمد شعیب مرزا، ڈاکٹر فار حسین خان، ابرار کرت پوری، رند اور سر یواستو، رفعت سروش، شاہد احمد شعیب اور بی.ایس. جین جوہر۔

(راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

● بیلپور (پیلی بھیت)۔ 2 جون، درکا سہائے سرور اکیڈمی کے زیر اہتمام غازی کمال شاہ کے عرس کے موقع پر کل ہند مشاعرے کا انعقاد کیا گیا، جس کی صدارت ایم حسین ہاشمی بریلی نے کی اور نظامت واصف فاروقی بہرائچی نے کی۔ مہمان خصوصی کی حیثیت سے انیس احمد خاں (وزیر مملکت اقلیتی فلاح وحج اتر پردیش) نے شرکت کی۔

مہمان اعزازی ڈاکٹر صوفی اسحاق حسین شاہ نے مہمانوں کی گل پوشی کی۔ اس کے بعد اکیڈمی کے جنرل سکریٹری وکنوینر مشاعرہ راحل فریدی، انیس احمد خاں (وزیر مملکت)، ایم حسین ہاشمی نے معروف شاعر عقیل نعمانی کو توصیفی سند، مومنٹو، شال اور نقد رقم پیش کر کے سرور ایوارڈ 2008 سے نوازا۔

جن شعرا نے کلام سنایا ان کے نام اس طرح ہیں:

ناز پرتاپ گڑھی، مشرف محضر علی گڑھ، عمر فاروقی سیتا پوری، عاصم کاشی پوری، شمس سکندر راوی، ہاشم نعمانی ڈنڈوارہ، نازیہ سحری ہلدوانی، راحل فریدی، شہزادہ ابصار، ساحل سحری، اسرار نہی، واصف فاروقی، طاہر فراز اور نشاط عرشی۔

(راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

● سہارنپور۔ 22 مئی، ادبی ادارہ ''اردو مرکز'' سہارنپور (رجسٹرڈ) کی جانب سے محلہ مطربان اسکول گلشن تعلیم کے ہال میں ''یادوں کے چراغ'' کے زیر عنوان سہارنپور کے محترم و بزرگ ادیب و شاعر مولانا انعام الرحمٰن انعام تھانوی اور ماسٹر محمد لیٰسین ارم عمرپوری (مرحومین) کی یاد میں ایک مشاعرہ منعقد کیا گیا، جس کی شمع مشترکہ طور پر صحافی شاہد زبیری اور سلمان تھانوی نے روشن کی۔ صدارت کے فرائض مشیر احمد خاں، منیجر مسلم فنڈ نے انجام دیے۔ نظامت رضوان سہارنپوری نے کی۔ مشاعرے کا آغاز ٹھیک 10 بجے شب میں ہارون صابر فریدی کی نعت پاک سے ہوا۔ مشاعرے کے کنوینرس رضوان سہارنپوری، سید محمد راشد اور سید ناصر زیدی نے آخر میں مہمان شعرا و معززین کا شکریہ ادا کیا۔ جن شعرا کو زیادہ پسند کیا گیا ان کے نام ہیں:

سید ناصر زیدی، ہارون صابر فریدی، نگر یز متین، پرہلاد آتش، سید راشد، رضوان سہارنپوری، نریندر مستانہ، خرم سلطان، حکم چند پیڑت، کے کے جنسل، بلال سہارنپوری، احسان وارثی، عابد حسن وفا، آسم پیرزادہ، فیاض ندیم، سید عثمان مطلوبی، سلمان فریدی، صلاح الدین، حاجی عبدالخالق اور ڈاکٹر محمد لیاقت کے نام قابل ذکر ہیں۔ (راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

● امروہہ۔ 27 مئی، انڈین کلچرل سوسائٹی کے زیر اہتمام سوسائٹی کے جنرل سکریٹری جناب میکش امروہوی کے دولت کدے پر ایک پر وقار محفل مشاعرہ کا اہتمام کیا گیا جس میں متعدد بیرونی شعرا و شاعرات نے شرکت فرمائی۔ مشاعرے کی صدارت امروہہ کے نمائندہ و منفرد شاعر طرب ضیائی نے فرمائی اور نظامت کے فرائض ڈاکٹر لاڈلے رہبر نے بحسن و خوبی انجام دیے۔ اس مشاعرے میں دہلی سے تشریف لائی مہمان محترمہ راشدہ باقی حیا اور ڈاکٹر شکور مرادآبادی کو اعزاز سے نوازا گیا۔ مشاعرے کی شمع جناب سید اعجاز حیدر اور حکیم پرویز اختر شاہدی نے مشترکہ طور پر روشن کی۔ مہمان خصوصی کے بطور سید حبیب الثقلین عسکر رضا ایڈوکیٹ نے شرکت فرمائی۔ میکش نے اپنے تمام مہمانان کا استقبال گلدستے سے کیا۔ ڈاکٹر شفاعت فہیم نے اپنی افتتاحیہ تقریر میں شاعروں و شاعری کے ذریعے اردو کی بقا و ترویج و ترقی پر تفصیل سے روشنی ڈالی۔ محمد طاہر کی تلاوت کلام پاک سے محفل کا آغاز ہوا۔ اس کے بعد جناب زبیر ابن سیفی نے نعت رسول پیش فرمائی۔ نمائندہ شعرا کے نام حسب ذیل ہیں:

طرب ضیائی، متین امروہوی، ڈاکٹر شفاعت فہیم، شہنشاہ صابری رامپوری، مسرور جوہر، انجم شاہجہاں پوری، راشدہ حیا دہلوی، ڈاکٹر شکور مرادآبادی، میکش امروہوی، رفیع سرسوی، ڈاکٹر لاڈلے رہبر، نسیم نوری علیگڑھ، جاوید رشید عامر مرادآباد، حسن امام، برکت مرادآبادی، محترمہ شبنم نسیم علیگڑھ، دلشاد نگینوی، اختر عظیم مرادآبادی، زبیر ابن سیفی، اسلم بقائی، نشتر امروہوی، شمیم عباس، ڈاکٹر نیاز مرادآبادی، مبارک امروہوی، شہاب انور ایڈوکیٹ، تمنا امروہوی، سامی امروہوی، ناظم امروہوی۔ محفل مشاعرہ رات تین بجے تک انتہائی کامیابی کے ساتھ چل کر اختتام پذیر ہوئی۔

(صحافت، دہلی)

● متھرا۔ 6 جون، ایوان ادب متھرا کے زیر اہتمام شاندار مشاعرے کا انعقاد امام باڑہ نقارچی ٹیلہ متھرا میں کیا گیا جس کی صدارت بابا عبدالغفور نے فرمائی اور نظامت کے فرائض ڈاکٹر سعید احمد نے بحسن وخوبی انجام دیے مہمان خصوصی کی حیثیت سے علی گڑھ سے تشریف لائے مہمان شاعر مشرف حسین محضر نے شرکت کی شمع افروزی بھی مشرف حسین محضر کے ہاتھوں عمل میں آئی۔ ڈاکٹر سعید احمد نے اپنے خطبے میں کہا کہ متھرا کے استاد شعرا نے ایوان ادب متھرا کی بنیاد تقریبا 40 سال پہلے ڈالی تھی جس کو آج پھر سے فعال اور متحرک بنایا گیا ہے جس کے لیے خصوصی طور سے دلشاد متھراوی اور شکیل احمد کاوش قابل ستائش ہیں۔ اپنے خطبے میں ایوان ادب کے صدر دلشاد متھراوی نے کہا کہ جانشین آزر مشرف حسین محضر نے آج کے مشاعرے میں تشریف لاکر مشاعرے کے وقار میں اضافہ کیا ہے اس کے لیے ہم ان کے شکر گزار ہیں۔ مشاعرے کا آغاز ہدیۂ نعت سے عزیز وفائی نے کیا۔ جن شعرا نے اپنے کلام سے سامعین کو محظوظ کیا ان کے نام حسب ذیل ہیں:

مشرف حسین محضر، شمشاد نسیم، ایم مبشر قمر، دلشاد متھراوی، شکیل احمد عباسی، محمد عمر کاوش، ڈاکٹر سعید احمد سعید، عزیز وفائی، شاہد ادیب، صدیق راز اور بھگوان داس اعجاز، مشاعرے کے اختتام پر کنوینر محمد اکبر اور شکیل احمد عباسی نے سبھی شعرائے کرام و سامعین کا شکریہ ادا کیا۔ مشاعرے کے بعد عشائیہ کا اہتمام نہایت ہی تزک و احتشام کے ساتھ کیا گیا۔ (ہمارا سماج، نئی دہلی)

● بجنور۔ 24 مئی، بین الاقوامی شہرت کے حامل پاکستان کے مصور سید اقبال مہدی امروہوی کے سانحۂ ارتحال پر ایک تعزیتی نشست کا انعقاد محلہ نئی بستی بی 14 میں سید حسنین نقوی کی رہائش گاہ پر کیا گیا، نشست میں سید اقبال مہدی کی فنکارانہ صلاحیتوں کو سراہا گیا اور انھیں خراج عقیدت پیش کیا گیا۔ مشہور و معروف مصور اور شاعر جناب شکیل بجنوری کی صدارت اور نامور ناظم مشاعرہ فاخر ادیب کی نظامت میں منعقدہ نشست کے مہمان خصوصی بجنور ٹائمس گروپ کے مدیر اعلی چندرمنی رگھوونشی تھے۔ شکیل بجنوری اور چندرمنی رگھوونشی نے سید

اقبال مہدی کی حیات اور فن پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ وہ ایک عظیم اور فطری مصور اور انتہائی معقول انسان تھے۔ انھوں نے کہا کہ مرحوم کی صلاحیتوں کا اندازہ اسی سے لگایا جا سکتا ہے کہ ہندوستان میں منعقدہ ایشیاڈ۔82 کی تقریبات کی تزئین کاری کے لیے حکومت ہند نے سید اقبال مہدی کو پاکستان سے بلایا تھا۔ شکیل بجنوری نے مزید کہا کہ چند برس قبل دہلی میں سید اقبال مہدی کی تصاویر کی نمائش کی گئی تھی جسے دیکھنے کے لیے سابق وزیر اعظم ہند وی پی سنگھ بھی تشریف لے گئے تھے۔ حالانکہ مسٹر سنگھ علیل تھے، لیکن وہ مہدی کے فن پاروں کو دیکھ کر اس قدر متاثر ہوئے کہ انھوں نے مہدی صاحب کو بانہوں میں بھر لیا تھا۔ نشست میں صلاح الدین اکرم نے نعت پاک پیش کر کے بارگاہ رسالت میں نذرانہ عقیدت پیش کی۔ اس کے بعد شعرائے کرام نے مرحوم کو منظوم خراج عقیدت پیش کیا، مشاعرے کی صدارت جناب شکیل بجنوری نے کی اور مقامی شعرا نے اپنے کلام سے سامعین کو محظوظ کیا۔ (صحافت، دہلی)

● رتلام۔ 30 مئی، اردو کے فروغ اور فنکاروں کو ان کی صلاحیتوں کے اظہار کے لیے مدھیہ پردیش اردو اکادمی نے فیصلہ کیا ہے کہ ریاست کے تمام اضلاع میں مشاعرے اور ادبی پروگرام منعقد کرائے جائیں۔ ساتھ ہی اردو سکھانے کے مراکز بھی قائم ہوں۔ مذکورہ خیالات کا اظہار اردو اکیڈمی کی سکریٹری نصرت مہدی نے یہاں اردو اکیڈمی کے ذریعے منعقدہ کل ہند مشاعر کے موقع پر بحیثیت مہمان خصوصی اپنی تقریر میں کیا۔ انھوں نے کہا کہ عالمی شہرت کے حامل پدم شری ڈاکٹر بشیر بدر کی رہنمائی اور وزیر اعلیٰ شوراج سنگھ چوہان کی قیادت میں اردو اکیڈمی ریاست کے تمام اہم شعرا اور ادیبوں سے رابطہ قائم کرنے لیے اقدامات کر رہی ہے یہ پروگرام بھی اسی کا ایک حصہ ہے۔ انھوں نے کہا کہ محض اردو الفاظ کے استعمال سے زبان زندہ نہیں رہ سکتی۔ زبان کی روح رسم الخط ہے اس کو برقرار رہنا چاہیے۔ انھوں نے مقامی منتظمین سے کہا کہ وہ بینر اور پوسٹر اردو میں بھی بنوائیں اور ہندی میں بھی کہ ہندی ہماری قومی زبان ہے اور دونوں کے درمیان کوئی تنازعہ نہیں ہے۔

رتلام میں کل ہند مشاعرہ حضرت شاہ بدیع الدین داد امدار کے عرس کے موقع پر قریشی عرس کمیٹی رتلام کے تعاون سے منعقد کیا گیا تھا۔ پروگرام کے مہمان خصوصی ہمت جی کوٹھاری، ریاستی وزیر داخلہ و رسل و رسائل تھے جو بوجوہ شریک نہ ہو سکے۔ صدارت رسول خان شیرانی نے کی۔ پروگرام کا آغاز معززین شہر اور شعرا کو گلدستے پیش کرنے سے ہوا۔ مشاعرے میں اختر گوالیاری (اوجین) حسن فتح پوری، نصرت مہدی، اقبال مسعود، ڈاکٹر جلیل الرحمن (برہانپور)، ضیا رانا (اوجین)، تاج الدین تاج، سحر اندوری (اندور) سلمان مجاز (کوروائی)، جلال مینکش، اعجاز اکمل (بانسواڑہ) کے علاوہ مقامی شعرا شبیر خان راہی، ماہر رتلامی اور صدیق رتلامی نے اپنے کلام سے سامعین کو محظوظ کیا۔ مشاعرہ چار بجے شب تک نہایت اہتمام سے چلا۔ نظامت معروف شاعر حسن فتح پوری اور سحر اندوری نے ادبی وقار اور تہذیب کے ساتھ ادا کی۔ مشاعرہ کمیٹی کے سعید قریشی اور محمد سلیم مئو نے عوام کا اور شعرا کے بھرپور تعاون کا شکریہ ادا کیا۔ (ڈاک سے)

رسم اجرا

● بھیونڈی کے معروف محقق اور ناقد خلیق الزماں نصرت کی تیسری کتاب ''بھیونڈی میں اردو'' کا پہلا حصہ ''شعرائے بھیونڈی (تنقید و تذکرہ) کی رسم اجرا'' محافظان مخطوطات، بھیونڈی'' اور ''ادب نامہ'' کے زیر اہتمام 11 مئی 2008 بروز اتوار شام چھ بجے غلام محمد ویمنز کالج (رئیس ہائی اسکول) کے وسیع ہال میں بڑے تزک و احتشام کے ساتھ عمل میں آئی۔ اس تقریب کی صدارت مشہور عالم و مدبر مولانا ابوظفر حسان ندوی ازہری صاحب نے فرمائی، نظامت کے فرائض یوسف دیوان نے ادا کیے اور ابتدائی کلمات ایم مبین نے پیش کیے، شجاع الدین انصاری صاحب کے ہاتھوں کتاب کی رونمائی ہوئی، مہمان خصوصی کی حیثیت سے جناب سہیل خاں (منیجر بمبئی مرکنٹائل بینک، بھیونڈی) اور جناب ابو البرکات صاحب (ریجنل ڈائرکٹر، مولانا آزاد اردو یونیورسٹی) نے بھی اس پروگرام میں شرکت کی۔

مولانا حسان ندوی نے اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ نصرت صاحب کی کتاب بھیونڈی کی شعری تاریخ ہے اس کی پذیرائی ضرور ہوگی۔ عبداللہ کمال نے کہا نصرت نے یہ شعری تاریخ مرتب کردی جو یقیناً قبولیت عام حاصل کرے گی۔ رفیع صاحب نے کہا کہ نصرت صاحب نے گویا سمندر کو کوزے میں بند کر دیا ہے۔

پروفیسر مجاہد حسین حسینی، ملک مومن، مفتی حذیفہ القاسمی صاحبان نے بھی ''شعرائے بھیونڈی'' اور خلیق الزماں نصرت کی ادبی خدمات کے اعتراف میں اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ عتیق اشعر مالیگانوی نے تہنیتی اشعار سنائے۔ دوران تقریب شجاع الدین انصاری صاحب نے ایم مبین کو ان کے ناول ''ریوڑ'' پر منشی پریم چند ایوارڈ ملنے پر محافظان مخطوطات (بھیونڈی) کی جانب سے مومنٹو پیش کیا۔ پروگرام شب میں ساڑھے آٹھ بجے اختتام پذیر ہوا۔
(ڈاک سے)

● نئی دہلی۔ 23 مئی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی ایک شاندار تاریخ ہے اور اس کے ہونہار طلبہ نے نہ صرف ملک بلکہ بیرون ملک میں بھی علی گڑھ اور ملک کا نام روشن کیا ہے۔ معروف شاعر مجاز لکھنوی بھی اس کے ہونہار طلبہ میں

سے ایک ہیں جنھوں نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کو ایک تاریخی اور یادگار ترانہ دیا۔ ان خیالات کا اظہار آج انڈیا اسلامک کلچرل سینٹر میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اولڈ بوائز ایسوسی ایشن دہلی کے زیر اہتمام صہبا لیاقت علی کی مرتب کردہ کتاب ''مجاز کی باتیں'' کی رسم اجرا کے موقع پر مقررین نے کیا۔ کتاب کا اجرا مرکزی وزیر قانون وانصاف ہنس راج بھاردواج نے کیا۔ اس کتاب کو خدا بخش لائبریری پٹنہ نے شائع کیا ہے۔ اس موقع پر اشتیاق احمد کی کیسیٹ سے تیار کردہ سی ڈی کا اجرا بھی عمل میں آیا۔ صدارتی خطبہ میں ہریانہ کے گورنر ڈاکٹر اے آر قدوائی نے کہا کہ انھیں علی گڑھ سے اپنی وابستگی پر فخر ہے۔ صہبا لیاقت علی نے مجاز کی باتوں اور یادوں کو بہت اچھے ڈھنگ سے اس کتاب میں پیش کیا ہے۔ انھوں نے اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کے ذریعے اشفاق احمد کی کیسیٹ کو سی ڈی کی شکل میں جاری کرنے کے کام کی بھی ستائش کی۔ مرکزی وزیر قانون وانصاف ہنس راج بھاردواج نے کہا کہ میں علی گڑھ کے معاملات سے ہمیشہ جڑا رہا۔ انھوں نے کہا کہ اے ایم یو نے ملک کو بہترین وکیل، ادیب، شاعر اور سائنسداں دیے۔ 'مجاز کی باتیں' کی مصنفہ صہبا لیاقت علی نے کہا کہ انھوں نے اس کتاب کو مرتب کرنے کے لیے مجاز کی کتابوں کے علاوہ ان پر لکھی گئی نثر اور شعری مواد کا مطالعہ کیا اور ان میں سے خاص خاص چیزیں لے کر اس کتاب کو مرتب کیا۔ انھوں نے کہا کہ اس کتاب میں مجاز کی کچھ مشہور نظمیں، ان کے لطیفے اور ان پر دوسروں کے ذریعے لکھے گیے مضامین اور ان سے متعلق میری اپنی یادداشتیں شامل ہیں۔ صہبا لیاقت علی نے کہا کہ اس کتاب کو لکھنے کا ایک اہم مقصد ان کے دوسرے پہلوؤں کو اجاگر کرنا بھی ہے۔ انڈیا اسلامک کلچرل سینٹر کے صدر سراج الدین قریشی نے کہا کہ اس کتاب سے نئی نسل کو مجاز کے بارے میں اور زیادہ جاننے کا موقع ملے گا۔ انھوں نے کہا کہ اس طرح کے کاموں اور پروگراموں کی حوصلہ افزائی کی جانی چاہیے اور انھوں نے یقین دہانی کرائی کہ اس طرح کے پروگراموں میں انڈیا اسلامک کلچرل سینٹر ہر ممکن تعاون کرے گا۔ خدا بخش لائبریری پٹنہ کے ڈائرکٹر امتیاز احمد نے کہا کہ لائبریری نے اپنی سو سالہ تاریخ میں ایسی 500 سے زیادہ کتابیں شائع کی ہیں۔ اس موقع پر ہریانہ اردو اکادمی کے سکریٹری نے مجاز کے تعلق سے بات کرتے ہوئے دو ماہ بعد چنڈی گڑھ میں مجاز پر سیمینار کرانے کا اعلان بھی کیا۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اولڈ بوائز ایسوسی ایشن دہلی کے صدر صفدر ایچ۔ خان نے خیر مقدمی کلمات پیش کرتے ہوئے صہبا لیاقت علی کا شکریہ ادا کیا کہ انھوں نے مجاز پر یہ کتاب لکھی۔ انھوں نے کہا کہ مجاز کو اردو کا کیٹس کہا جاتا ہے۔ انھوں نے اس کتاب کو شائع کرنے کے لیے خدا بخش لائبریری پٹنہ کا بھی شکریہ ادا کیا۔ انھوں نے کہا کہ اولڈ بوائز ایسوسی ایشن نے اشتیاق احمد کی بنائی گئی کیسیٹ کی سی ڈی تیار کرائی ہے جو ایک اہم کام ہے۔ اس سی ڈی میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی تقریباً مکمل تاریخ اور نغمۂ علی گڑھ بھی موجود ہے۔ معروف شاعر ڈاکٹر ماجد دیوبندی نے اس موقع پر اپنے خاص ترنم میں مجاز لکھنوی کی مشہور نظم ''اے غم دل کیا کروں' اے وحشت دل کیا کروں'' پیش کی۔ آخر میں اولڈ بوائز ایسوسی ایشن دہلی کے سینئر نائب صدر ڈاکٹر وسیم خان نے اظہار تشکر کیا۔ جنرل سکریٹری فصیح اللہ خان نے نظامت کی۔ اسٹیج پر اے ایم یو کی سابق طالبہ اور سابق مرکزی وزیر محسنہ قدوائی اور عذرا سلطانہ بھی موجود تھیں۔ (راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

● حیدرآباد۔ 22 مئی، اردو کے نامور افسانہ نگار انور رشید کا افسانوی مجموعہ ''پھر گرفتار ہوئے'' کی رسم اجرا 20 مئی کو انیس الرحمٰن بلاک اردو ہال میں محترمہ جیلانی بانو کے ہاتھوں عمل میں آئی، علی ظہیر کی صدارت میں حسن فرخ، قدیر زماں اور ڈاکٹر یوسف اعظمی نے انور رشید کی شخصیت اور فن پر اظہار خیال کیا۔ مظہر مہدی سکریٹری حلف نے نظامت کے فرائض انجام دیے۔ اس موقع پر محترمہ جیلانی بانو نے کہا کہ یہ افسانے 1984 سے پہلے لکھے گئے تھے انور رشید کے فن کی اہمیت اور ان کی شخصیت کی اہمیت کا اندازہ اس کتاب کی اشاعت سے ہو رہا ہے۔

حسن فرخ نے کہا کہ انور رشید کی اس کتاب میں گیارہ افسانے ہیں جس میں بیانیہ بھی ہے اور تخلیقی زبان بھی ہے اور کہانی پن بھی ہے۔ ان کی کہانیوں میں برصغیر کے کسی شہر کے متوسط طبقے کے حالات زندگی ان کی مجبوریوں، بے بسیوں اور پھر اپنے طور پر اس کا جواز پیش کرنے کی تفصیل موجود ہے۔ جو اس کی زندگی کا حصہ بھی ہے اور اس سے اسے محبت بھی ہے اور نفرت بھی۔ حلف پر اس تصنیف کی اشاعت کا قرض تھا۔ مظہر مہدی اور بیگ احساس مبارکباد کے مستحق ہیں کہ ان کی توجہ کی وجہ سے یہ کام ہو سکا، قدیر زماں نے انور رشید کی زندگی پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ وہ ایک بے باک ادیب تھا جس نے مصلحتوں کو روا نہیں رکھا اس لیے اس کے فن میں بھی لاگ لپیٹ نہیں ہے۔ ڈاکٹر یوسف اعظمی نے ان افسانوں کا تفصیلی جائزہ لیتے ہوئے کہا کہ انور رشید اپنے فن کو سماج کی ذمے داری کی طرح قبول کرتا تھا اور فن کو ستائش کے معیارات پر نہیں آنکتا تھا بلکہ اپنی بات کی اہمیت کا قائل تھا، ابتدا میں مظہر مہدی سکریٹری حلف نے کہا کہ جب ترقی پسند ادب کا سورج ماند پڑ رہا تھا اور جدیدیت کی کرنیں بڑی ملائم تھیں اس عہد میں انور رشید نے لکھنا شروع کیا، ان کا ایک مجموعہ ''زوال کے مقابل'' ان کی حیات میں شائع ہوا۔ جس کا ایک افسانہ مسلخ میں بھیڑوں کا ماتم اردو فکشن میں ہلچل کا باعث ہوا لیکن موت نے انہیں اتنی مہلت نہیں دی کہ وہ اپنی دوسری کتاب دیکھ سکیں، 29 جولائی

1985 کو یہ مسودہ ہمارے حوالے کرکے چل بسے، علی ظہیر نے اپنی صدارتی تقریر میں پیش کیے گیے مضامین پر رائے دیتے ہوئے کہا کہ اردو ادب میں شمال اور جنوب کے فرق کو خاصی اہمیت دی گئی اور جنوب کے ساتھ بے اعتنائی کا شکوہ بھی کیا گیا لیکن اس میں صداقت کم ہی ہے۔ انھوں نے انور رشید پر ایک نظم بھی پیش کی۔ (منصف، حیدرآباد)

● سنبھل۔ 2 جون، فرقان سنبھلی کی کتاب ''اردو صحافت اور ضلع مراد آباد'' کا اجرا بدست ڈاکٹر سنجیو لال عمل میں آیا، پتر کار سنگھ کے صدر نریش شکلا ایڈوکیٹ، ابھے پال رستوگی اور کھیم سنگھ چاہل اور نریش شکلا نے فرقان سنبھلی کی شخصیت، فن اور تحریروں کا ذکر کیا۔ پتر کار سنگھ کے عہدیداران اور کارکنان کو یہ باور کرایا کہ انھیں کبھی سچائی کا دامن نہیں چھوڑنا چاہیے۔ اس کے لیے انھیں کتنی ہی دشواریوں سے کیوں نہ گزرنا پڑے۔ اجرا کے موقع پر جو اہم شخصیات موجود تھیں ان کے اسمائے گرامی اس طرح ہیں: ظہیر انور ایڈوکیٹ، شاہ حسین عارف، ڈاکٹر آنند، نیتا چھدا، دھرمیندر کمار، نسیم سیفی، یوسف انصاری، کمال زیدی، منیش چودھری، تنویر انصاری، لیش پال چاہل، راشد مرزا، ہرد واری لال گوتم، عبدالرحمٰن ایڈوکیٹ، راجیور چودھری، ڈاکٹر راجیش، مزمل دانش، اور عتیق الرحمٰن وغیرہ۔ (ہمارا سماج، دہلی)

● نئی دہلی۔ 27 مئی، ہر تبدیلی کو منفی طور پر دیکھنے کا رجحان اردو ادب میں ختم ہو رہا ہے کیونکہ خوف وتشکیک کی جگہ امکانات پر یقین نے لے لی ہے۔ اس لیے نئے لکھنے والوں نے رد تشکیل کی سابقہ تحریکوں کے بے ہنگم دائرے سے باہر نکل کر سوچنا شروع کر دیا ہے۔ اس انقلاب آفریں تبدیلی کی تازہ تصدیق اردو کے لیے نامانوس نہیں تو بہت حد تک الگ تھلگ صوبے اڑیسہ کے شاعر سہیل اختر کے اولین شعری مجموعے 'کاغذ پہ صحرا' سے ہوتی ہے جس میں انھوں نے صرف غزلوں کے ذریعے اپنے جذبات واحساسات پیش کیے ہیں۔ شاعر نے نہ صرف اپنی سوچ اور ان امنگوں کو الفاظ کے پیکر میں کامیابی سے ڈھالا ہے بلکہ یہ دکھانے کی بھی کوشش کی ہے کہ تبدیلیاں اندیشوں سے زیادہ امکانات سامنے لاتی ہیں۔ مجموعے کا نام کاغذ پہ صحرا سہیل کا اپنا انتخاب ہے لیکن مجموعی طور پر ان کی شاعری میں ان کے داخلی اور خارجی احساسات اور مایوسیوں سے کہیں بھی سمجھوتہ کرتے نظر نہیں آتے گو کہ شعری روایات سے انھوں نے دوٹوک دامن بھی نہیں چھڑایا۔ سہیل اختر نے اس مجموعے کے ذریعے جس میں 80 فیصد غزلیں 2001 کے بعد کی ہیں عصری حسیت کے ساتھ انصاف کی کما حقہ کوشش کی ہے اور ناخوشگوار تجربات بھی امکانی خطوط پر نظم کیے ہیں۔ مشرقی اتر پردیش کے ضلع غازی پور سے تعلق رکھنے والے شاعر کے یہاں لفظوں کو برتنے اور زبان کے ساتھ مکمل انصاف میں کہیں کہیں وہ لغزشیں بھی نظر آتی ہیں جو موجب تعزیر نہیں کیونکہ دنیا کی کوئی زبان خطہ وار تہذیبی تبدیلیوں سے غیر متاثر رہ کر زندہ بھی نہیں رہ سکتی۔ گلوبلائزیشن کے نتیجے میں زائد از ایک تہذیبوں کے ملاپ میں شدت سے الفاظ واستعارے کے ذخیرے گزشتہ دس برسوں میں کافی بڑھے ہیں اور ان سے عوامی سطح پر استفادہ بھی عام ہو رہا ہے۔ (اخبار مشرق، کولکاتا)

یادرفتگاں

● کانپور۔ 18 مئی، مولانا حسرت موہانی کے 57 ویں یوم وفات پر خسرو۔ کبیر فاؤنڈیشن کے تحت اسلامک ہائر سیکنڈری اسکول میں ایک جلسے کا انعقاد کیا گیا، جس میں شہر کی معزز شخصیات شریک ہوئیں، یہ جلسہ مولانا حسرت موہانی کے کارناموں سے نئی نسل کو واقف کرانے کے لیے منعقد کیا گیا تھا۔ جلسے کی صدارت آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ کی مجلس منتظمہ کے رکن ڈاکٹر نعیم حامد نے کی۔ انھوں نے اپنی صدارتی تقریر میں کہا کہ مولانا حسرت موہانی ان لوگوں میں سے تھے جو راتوں رات ملک وقوم کی تقدیر بدل دینے کے خواہاں تھے، حالانکہ یہ غیر ممکن بات ہے لیکن حسرت موہانی کے جذبہ صادق کی قدر کرنی چاہیے۔ ملک وقوم کے لیے باوقار زندگی کی راہیں ہموار ہوں، وہ ساری زندگی اسی بات کی جدوجہد کرتے رہے۔ فاؤنڈیشن کے صدر جناب راشد حسین ناری نے اپنے استقبالیہ خطبے میں کہا کہ آج کی سیاست جو ضمیر فروشی پر مبنی ہے اور نام ونمود حاصل کرنے کا ذریعہ سمجھی جانے لگی ہے اگر حسرت موہانی جیسے لوگوں کے نقش قدم پر چلتی تو یہ ملک ساری دنیا کے لیے ایک مثال بن چکا ہوتا، میں فاؤنڈیشن کی جانب سے وعدہ کرتا ہوں کہ حسرت موہانی کے شایان شان ایک عظیم الشان سیمینار منعقد کیا جائے گا جس میں ملک بیرون ملک سے دانشوروں کو مدعو کیا جائے گا، تاکہ حسرت موہانی کی شخصیت اور فکر وفن کے مزید پہلو اجاگر ہو سکیں۔ سابق ایم ایل اے حافظ محمد عمر نے کہا کہ حسرت موہانی ایک دور اندیش سیاست داں تھے۔ انھوں نے بیسویں صدی کے اوائل میں جن نکات کی طرف توجہ دلانے کی کوشش کی وہ اپنے وقت سے آگے کی باتیں ہونے کی وجہ سے اس وقت کے اہم لوگوں کی توجہ حاصل نہ کر سکیں لیکن وقت کے ساتھ ساتھ حسرت موہانی کی ہر بات کو کسی نہ کسی طرح قابل قبول سمجھا گیا اور عمل میں لایا گیا، خواہ مکمل آزادی کی تجویز ہو یا روزگار فراہمی کی گارنٹی۔ ایسی شخصیت کو یاد کرکے خسرو۔ کبیر فاؤنڈیشن نے ایک بڑا کام کیا ہے۔ میں اس سے وابستہ ہر شخص کو مبارکباد دیتا ہوں۔ جناب ابوالبرکات نقمی نے کہا کہ حسرت موہانی کے سوکھی روٹی کھانے اور ریل کے تھرڈ کلاس ڈبے میں سفر کرنے کی بات کو فخریہ کہنا اور بات ہے اور ان پر عمل کرنا اور

بات۔ آج ہم قول وفعل کے اپنی تضاد کی وجہ سے مار کھا رہے ہیں۔ ایسے لوگ اب ناپید ہوگئے ہیں، جو سامنے والے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرسکیں، اب تو ہر شخص خوشامدانہ اور مصاحبی کا رویہ اپنا کر زر ومال سمیٹ لینے کے چکر میں ہے۔ حسرت موہانی جیسے لوگوں پر اب صرف باتیں کرنے سے کام نہیں چلے گا بلکہ ان کے قدموں کے نشانات پر چلنے ہی میں ہماری فلاح ہے، ہم غیروں کی طرف سے نظریں ہٹا کر دیکھیں تو سہی، ہم آج بھی وہ کارنامے انجام دے سکتے ہیں کہ زمانہ دانتوں تلے انگلیاں دبالے، خود اعتمادی ہی حسرت موہانی کا اصل پیغام ہے، اور یہی ہماری نجات کا راستہ بھی۔ آل انڈیا ملی کونسل کے یوپی کے صدر جناب لطیف عباس نے کہا کہ مولانا حسرت موہانی کی زندگی کا مطالعہ کرتے ہوئے صاف محسوس ہوتا ہے کہ مولانا ایک مکمل انسان تھے، یہ نہایت افسوس کی بات ہے کہ آزادی کے بعد سیاسی سطح پر حسرت موہانی اور ابوالکلام آزاد کو نظر انداز کرنے کی کوشش کی گئی، یہ دونوں حضرات زبردست سیاسی بصیرت رکھتے تھے، ان میں قائدانہ صلاحیتیں خداداد تھیں، ان کے نظریات اور کوششوں سے آزادی کے پہلے اور بعد میں ہماری سیاسی جماعتوں نے بہت فائدہ اٹھایا، لیکن ان کے نام لینے میں وہ ہمیشہ بخل سے کام لیتی رہیں۔ سابق کارپوریٹر ماسٹر محمد شاہد نے کہا کہ مکمل آزادی کی تجویز ہو یا سودیشی تحریک، روزگار گارنٹی کا معاملہ ہو یا مدارس عربیہ کا بورڈ بنانے کا معاملہ، مولانا کی زندگی میں ان کی ہر تجویز کو مسترد کردیا گیا، لیکن ان کی انھی تجاویز کے بعد میں دوسروں نے پیش کیا، جو نہایت خوش اسلوبی اور خوش دلی سے قبول کرلی گئیں۔ سابق کارپوریٹر حنیف صابری نے کہا کہ رئیس المتغزلین، سیدالاحرار، مولانا حسرت موہانی نے تمام سیاسی جماعتوں کو پرکھنے کے بعد ملی سیاست کا رخ کیا اور یہی ایک طریقہ ہے ملت مرحوم کو سرخ رو کرنے کا، جب میں کونسلر تھا تو میں نے پرزور کوشش کی کہ مول گنج چوراہے کا نام حسرت موہانی چوراہا رکھا جائے، کہ یہی وہ جگہ ہے جہاں اس فرزند ملک وقوم نے ہندوستان کی مکمل آزادی کا نعرہ دیا تھا۔ حنیف صابری نے پرزور اپیل کی کہ مسٹن روڈ علاقے کے تمام رہنے والے ظالم و جابر جیمس مسٹن کا نام ہٹا کر مولانا حسرت موہانی روڈ لکھ دیں۔

جلسے کا آغاز ''انوار قوم'' کے چیف ایڈیٹر جناب زبیر احمد فاروقی نے تلاوت قرآن کریم سے کیا اور اپنی تقریر میں اپنے والد مولانا شمیم احمد فاروقی کے حوالے سے مولانا حسرت موہانی پر ذاتی زندگی کے بہت سے دلچسپ واقعات سنائے، آخر میں فاؤنڈیشن کے نائب صدر جناب سید وسیم الحسن ہاشمی نے شرکا کا شکریہ ادا کیا، جلسے کی نظامت فاؤنڈیشن کے جنرل سکریٹری خان احمد فاروق نے کی، جلسے کا اختتام ڈاکٹر ابوالخیر کشفی کے لیے دعائے مغفرت پر ہوا، جن کا حال ہی میں کراچی میں انتقال ہوگیا ہے۔ جلسے میں مولانا حسرت موہانی کی بیٹی خالدہ موہانی کی پوتی جویریہ موہانی، اخلاق چشتی، محمد حبیب خاں اچھن، سحر صدیقی، عشرت ظفر، طہٰ فاروقی، رضوان حامد، قیوم ناشاد، مقصود احمد، غلام مصطفےٰ فراز، اسلم محمود، لطافت حسین، شیخ عبدالحمید، ڈاکٹر آرا ے صدیقی، شفیق الرحمٰن، چودھری ریاض الدین، معین الاسلام، محمد سمیع، یوسف آزاد، ڈاکٹر شوکت اسلام، یاسر عرفات، سید سعید احمد، عبدالحنان، ڈاکٹر خان حفیظ، محمد عارف، نسیم رضا، حسان اعظمی، سمیع فراز، حافظ ظہیر، عارف فاروق، شاعر فتح پوری وغیرہ موجود تھے۔ (ڈاک سے)

● برلن۔ 22 مئی، ہمبولٹ یونیورسٹی برلن کے سابق مہمان پروفیسر ڈاکٹر کے ایم اشرف کی یاد میں اتوار 18 مئی کو برلن میں اردو انجمن برلن کے زیراہتمام ایک جلسہ کیا گیا جس میں بڑی تعداد میں ہندوستانی، پاکستانی اور جرمن اسکالروں نے شرکت کی۔ اس موقع پر ایک مشاعرہ بھی منعقد کیا گیا نیز مشہور ہندوستانی مغنیہ شُبھا گنگولی نے اردو کی کلاسیکی غزلوں کو اپنی مترنم آواز میں پیش کیا۔ سُمتر و پاؤل نے طبلے کی تھاپ اور سیباستیان ورایئر نے ستار کی جھنکار سے محفل میں سماں باندھا۔

جلسے کا آغاز کرتے ہوئے اردو انجمن کے نائب صدر انور ظہیر رہبر نے مہمانوں کا خیر مقدم کیا۔ اس کے بعد اردو انجمن کے صدر عارف نقوی نے انجمن کے اغراض و مقاصد پر روشنی ڈالتے ہوئے بتایا کہ اردو انجمن برلن ہر اس شخص کا خیر مقدم کرتی ہے جسے اردو زبان و ادب سے پریم ہے۔ انھوں نے اس پر افسوس ظاہر کیا کہ برلن میں ڈاکٹر اشرف کو جن کا اسی شہر میں 1962 میں انتقال ہوا تھا، نیز ڈاکٹر ذاکر حسین اور ڈاکٹر عبدالعلیم کو جنھوں نے یہاں کی یونیورسٹی سے 1926 اور 1932 میں ڈاکٹریٹ کی تھی، فراموش کردیا گیا ہے۔ پروفیسر اشرف کی زندگی پر روشنی ڈالتے ہوئے عارف نقوی نے بتایا کہ اشرف کی پیدائش 1903 میں علی گڑھ کے قریب ایک گاؤں میں راجپوت گھرانے میں ہوئی تھی۔ ایم اے اور ایل ایل بی انھوں نے علی گڑھ سے کیا اور پی ایچ ڈی کی ڈگری لندن جاکر حاصل کی۔ Medival India کے لوگوں کی سماجی وتہذیبی زندگی پر ان کی تھیسس تاریخی تحقیق کا بہترین نمونہ مانی جاتی ہے۔ انھوں نے اسکولی زمانے سے آزادی کی تحریک میں حصہ لیا۔ وہ مولانا محمد علی کی خلافت تحریک اور مہاتما گاندھی کی سوراج تحریک سے بھی بہت متاثر ہوئے۔ چوراچوری کے واقعے کے بعد جب گاندھی جی نے تان کو آپریشن تحریک کو واپس لے لیا تو اس سے انھیں بہت مایوسی ہوئی تھی۔ جب مہاراجہ الور سے اشرف کی دوستی ہوئی تو انھوں نے انھیں 1927 میں لندن میں تعلیم کے لیے بھیجا مگر بعد میں وہ مہاراجہ سے ایسے بدظن ہوئے کہ نہ صرف انھوں نے

مہاراجہ کی نوکری چھوڑ دی بلکہ مہاراجہ کے خلاف میواتی کسانوں کی مسلح تحریک میں بھی نمایاں رول ادا کیا۔ 1929 کے آخر میں وہ دوبارہ لندن گئے اور وہاں ان کی ملاقات مارکسی دانشوروں سے ہوئی اور ان پر اشتراکی خیالات کا غلبہ ہوگیا۔ 1932 میں ہندوستان لوٹ کر انھوں نے آزادی کی تحریک اور اشتراکی تحریک میں بھرپور حصہ لیا۔ وہ جواہر لعل نہرو اور مولانا آزاد کے، جب وہ کانگریس کے صدر تھے سکریٹری بھی رہے اور دوسری جنگ عظیم کے دوران جیل میں بھی دن گزارے اور وہاں تیس دن کی بھوک ہڑتال کی۔ 1922 کے ہندو مسلم فسادات اور 1947 کے ہولناک فسادات نے، جنھیں انھوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا، ان پر بہت گہرا اثر کیا۔ وہ کچھ عرصے کے لیے پاکستان بھی گئے جہاں انھیں غیر قانونی طور سے ملک میں داخل ہونے کے الزام میں جیل میں رکھا گیا۔ وہاں سے چھوٹ کر وہ دوبارہ ہندوستان آئے تو دو برس تک سرکار نے انھیں شہریت نہیں دی۔ دو سال کے بعد جب انھیں شہریت ملی تو وہ دلی یونیورسٹی کے کروڑی مل کالج کے شعبۂ تاریخ کے صدر کے عہدے پر فائز ہوئے اور پھر 1960 میں برلن کی ہمبولٹ یونیورسٹی میں مہمان پروفیسر کی حیثیت سے پڑھانا شروع کیا۔ 7 جون 1962 کو برلن میں اچانک حرکت قلب بند ہوجانے کے باعث ان کا انتقال ہوگیا۔

اشرف ہندوستانی شخصیتوں میں سب سے زیادہ مولانا حسرت موہانی اور ان کی بیگم سے متاثر ہوئے تھے۔ جیسا کہ خود انھوں نے اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے: ''مصطفیٰ کریم کی تعلیم جہاد کے بعد حسرت اور بیگم حسرت عملی نمونے کے طور پر سامنے آئے تو ایک زمانے تک اس کسوٹی پر کوئی دوسرا رہنما پورا نہ اتر سکا۔'' ڈاکٹر اشرف کے ایک پرانے شاگرد، ڈاکٹر فریڈیمان شلندر نے، جو حال ہی میں جرمنی کے براڈ کاسٹنگ اسٹیشن'' ڈاچے ویلے'' کے ایشیائی شعبے کے صدر رہ کر ریٹائر ہوئے ہیں، تقریر کرتے ہوئے بتایا کہ ڈاکٹر اشرف کے آنے سے پہلے ہمبولٹ یونیورسٹی میں صرف قدیم ہندوستانی تاریخ، خصوصاً ویدک دور کے بارے میں بتایا جاتا تھا۔ ہمارے سامنے صرف رامائن وغیرہ کی روایتی تصویریں تھیں۔ ڈاکٹر اشرف کے لکچروں نے پہلی بار ان کی آنکھیں کھولیں اور انھیں معلوم ہوا کہ یہ ہندوستانی تاریخ صرف ویدک تاریخ نہیں ہے۔ تقاریر کے بعد مشاعرے کا دور شروع ہوا جس کی نظامت محترمہ عشرت معین سیما نے انجام دی۔ مشاعرے میں ہمبرگ سے آئی ہوئی مہمان شاعرہ محترمہ طاہرہ رباب، عارف نقوی، فارسی شاعر کاؤس ابراہیمی، خواجہ حنیف تمنا، عشرت معین سیما، انور ظہیر رہبر، انور بیابانی ارشاد خاں، ناہید ادا، سرور غزالی اور اختر سعید وغیرہ نے اپنا کلام سنایا اور حاضرین سے داد حاصل کی۔

(ڈاک سے)

● فیض آباد۔ 28 مئی، مجروح سلطانپوری ایک عہد ساز شخصیت کے مالک تھے۔ انھوں نے اپنی زندگی میں اصولوں سے سمجھوتہ نہیں کیا اور ہمیشہ غریبوں، مظلوموں اور بے سہارا لوگوں کے حق میں آواز بلند کرتے رہے۔ وہ اپنے آپ میں ایک انجمن تھے۔ ان خیالات کا اظہار طاہرہ ہاسپٹل کمپاؤنڈ کے حکیم ابن ہال میں منعقدہ ''ایک شام مجروح سلطانپوری کے نام'' پروگرام میں ممبر پارلیمنٹ مترسین یادو نے کیا۔ مجروح صاحب کی برسی پر ہونے والے اس مذاکرے اور شعری نشست کی صدارت سپا کے سینئر لیڈر منصور الٰہی ایڈوکیٹ نے کی۔ انھوں نے اعلان کیا کہ بہت جلد مجروح کی یاد میں ایک یادگاری مجلہ شائع کیا جائے گا جس میں مشاہیر اہل قلم کے تاثرات کو جگہ دی جائے گی۔ ڈاکٹر عرفی نے انھیں خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے بتایا کہ مجروح اور حکیم ابن کی یاد میں آل انڈیا مشاعرہ شروع کیا جاچکا ہے۔ نظامت مزمل فدا نے کی۔ مشاعرے میں درج ذیل شعرانے شرکت کی:

ڈاکٹر عرفی، عشرت حسین عشرت، احتشام وفا، مزمل فدا، رام جیت یادو 'بیدار'، شاندار رضوی، ڈاکٹر قمر ماہری، فاروق فیض آبادی وغیرہ۔

وفیات

ابوالخیر کشفی

● کراچی میں ڈاکٹر ابوالخیر کشفی رحلت کرگئے۔ وہ کانپور کے رہنے والے تھے لیکن تقسیم ملک کے بعد کراچی چلے گئے تھے۔ انھوں نے کئی کتابیں یادگار چھوڑی ہیں جن میں ہمارے عہد کا ادب و ادیب، جدید اردو ادب کا تنقیدی جائزہ، ہمارے ادبی اور لسانی مسائل، یہ لوگ بھی غضب کے تھے، غالب کی چھ غزلیں اور وطن سے وطن تک شامل ہیں۔ ان کی ایک کتاب پر، جو 1707 سے 1857 تک کی ہندوستان کی سیاسی اور سماجی صورتِ حال کے جائزے پر مبنی تھی، پاکستان کا اہم ادبی اعزاز'' داؤد جی ادبی انعام'' تفویض کیا گیا تھا۔ ان مستقل تصانیف کے علاوہ ان کے بہت سے تحقیقی، تنقیدی اور سوانحی مضامین مختلف ادبی رسائل میں شائع ہوتے رہے۔ وہ کراچی سے نکلنے والے اپنے زمانے کے موقر جریدے ''مہر نیمروز'' کے ادارے میں بھی سرگرم رہے۔ اس رسالے کا ایک مستقل کالم ''چہ دلاور است دزدے'' تھا جو ادبی چوریوں کی پردہ کشائی کے لیے وقف تھا۔ یہ فریضہ بالعموم کشفی صاحب ہی انجام دیا کرتے تھے۔ کشفی صاحب شاعر بھی تھے اور نعت گوئی سے انھیں خصوصی شغف تھا۔

کشفی صاحب ایک اچھے استاد بھی تھے۔ ان کے تلامذہ میں کئی لوگوں

نے ادب میں نام پیدا کیا۔ وہ تحریر کے ساتھ ساتھ تقریر کے بھی وصفی تھے۔ ان کی تحریروں کی طرح ان کی تقریریں بھی خیال انگیز ہوا کرتی تھیں۔ دھیمے اور متین لہجے میں وہ بڑی گہری باتیں کہہ جایا کرتے تھے اور ان کی کہی ہوئی ہر بات سند کا درجہ رکھتی تھی۔ کراچی میں ان کے پس ماندگان میں بیوہ کے علاوہ ایک بیٹا اور چار بیٹیاں ہیں۔ کانپور میں ان کے دو چھوٹے بھائی ابوالحسنات حقی اور ابوالبرکات نظمی ہیں جن سے پوری اردو دنیا واقف ہے۔ خدا مرحوم کی مغفرت فرمائے اور پس ماندگان کو ان کی دائمی جدائی کا صدمہ برداشت کرنے کی ہمت عطا کرے۔

انور علی دہلوی

● نئی دہلی۔ 9 جون، دہلی کی مشہور سیاسی وسماجی شخصیت انور علی دہلوی کا آج دوپہر طویل علالت کے بعد انتقال ہوگیا۔ وہ تقریباً 90 سال کے تھے۔ مرحوم انور علی دہلوی کا ایک لمبا سیاسی اور صحافتی سفر رہا ہے۔ اس کے علاوہ سینٹرل حج کمیٹی، دہلی وقف بورڈ اور بچوں کا گھر کے بھی ممبر رہے۔ ان دنوں دہلی گیٹ قبرستان اہل اسلام کے صدر تھے۔ انور علی دہلوی نے صحافت کے میدان میں بھی نمایاں خدمات انجام دیں۔ وہ ایک طویل عرصے تک کانگریس سے وابستہ رہے لیکن آخر میں اپنی اس پرانی پارٹی سے بددل ہوکر انھوں نے بھارتیہ جنتا پارٹی میں شمولیت اختیار کرلی تھی۔ وہ 15 سال تک دہلی میٹروپولیٹن کونسل کے ممبر رہے۔ وہ دہلی اردو اکادمی کے بانیوں میں تھے۔ عورتوں کا ماہانہ رسالہ ''بانو'' انھی نے جاری کیا تھا جس کی مدیرہ ان کی بیگم زینت انور تھیں۔ بعد میں انھوں نے یہ رسالہ ادارہ ''شمع'' کو دے دیا تھا۔ انھوں نے دہلی سے روزنامہ ''عوام'' بھی جاری کیا تھا جواب شاہد صدیقی صاحب کی ادارت میں نکل رہا ہے۔ پسماندگان میں بیوہ اور 4 بیٹے اور 8 بیٹیاں شامل ہیں۔ انور علی دہلوی دو سال سے مسلسل بیمار تھے۔ ایک ہاتھ اور ایک پیر نے کام کرنا تقریباً بند کردیا تھا۔ طویل علالت کے بعد آج دوپہر اپنے گھر پر انھوں نے آخری سانس لی۔ وہ اپنے والدین کے اکلوتے بیٹے تھے اس لیے ان کی پرورش بڑے لاڈ پیار کے ساتھ ہوئی تھی۔ اس کے باوجود وہ انتہائی سادہ مزاج صفت کوش اور قناعت پسند تھے۔ انھوں نے اخیر تک فقیرانہ زندگی گزاری۔ طویل عرصے تک سیاست میں رہنے کے باوجود انھوں نے دنیوی آرام و آسائش کا کوئی سامان فراہم نہیں کیا، نہ جائداد بنائی۔ اطلاعات کے مطابق دہلی کی وزیر اعلیٰ شیلا دکشت نے ان کی بیماری کے دنوں میں کئی بار مالی تعاون کی پیشکش کی جسے انھوں نے قبول نہیں کیا۔ آج بعد نماز عشا دہلی گیٹ قبرستان میں ان کی تدفین عمل میں آئی۔ بڑی تعداد میں لوگوں نے جنازے میں شرکت کی اور مرحوم کے لیے ایصال ثواب کیا۔ دلی کے سیاسی اور ثقافتی حلقوں کی طرف سے ان کی رحلت پر تعزیتی نشستوں کا سلسلہ جاری ہے اور ان کی بے لوث خدمات کو ہر شخص یاد کررہا ہے۔

حفیظ بنارسی

● نئی دہلی۔ 16 جون، اردو کے بزرگ شاعر پروفیسر حفیظ بنارسی کا آج صبح دارالشی میں انتقال ہوگیا۔ وہ 75 برس کے تھے۔ پسماندگان میں دو بیٹیاں اور پانچ بیٹے ہیں۔ یہ اطلاع ماہنامہ ''رہنمائے تعلیم'' کے معاون مدیر قمر سنبھلی نے دی ہے۔ پروفیسر حفیظ بنارسی کے انتقال سے شعروادب کی دنیا کو خاصا نقصان پہنچا ہے۔

ان کا پہلا شعری مجموعہ ''درخشاں'' 1969 میں شائع ہوا تھا دوسرا مجموعہ ''قول وقسم'' 1975 میں شائع ہوا اور تیسرا مجموعہ ''غزالاں'' 1984 میں شائع ہوا تھا۔ ان کا کلیات بھی ''سفیر شہر دل'' کے نام سے 2007 میں شائع ہوا تھا۔ انھوں نے اردو کی تمام مروجہ اصناف میں طبع آزمائی کی لیکن وہ بنیادی طور پر غزل کے شاعر تھے۔

رضیہ فاروقی

● 6 جون 2008 کی رات کے ساڑھے گیارہ بجے دہرہ دون میں پروفیسر نثار احمد فاروقی مرحوم کی اہلیہ محترمہ رضیہ فاروقی کا انتقال ہوگیا۔ وہ 70 سال کی تھیں۔ ان کی پیدائش بھی دہرہ دون میں ہی ہوئی اور 1967 میں نثار احمد فاروقی سے ان کی شادی ہوئی۔ ان کا خاندان امروہہ کا ایک علمی خاندان تھا جس میں تصوف کی روایت اتنی پرانی تھی کہ نثار صاحب بابا فرید گنج شکر کی نسبت سے اپنے نام کے ساتھ فریدی بھی لکھا کرتے تھے۔ ان کے پسماندگان میں دو بیٹے اور دو بیٹیاں ہیں۔ □□□

بچوں کی صلاحیتیں ان کی مادری زبان سے ابھرتی ہیں۔
گھروں میں بہتر اردو تعلیم کا انتظام کیجیے۔
اردو کی نئی نسل کو تیار کرنا ہم سب کا فرضِ اولیں ہے۔

تبصرہ وتعارف

● آبشار اور آتش فشاں (تنقیدی مضامین)

مصنف: فضیل جعفری

صفحات: 368، قیمت: 160

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک۔1، آر۔کے۔پورم، نئی دہلی۔66

مبصر: جاوید رحمانی، 401/2-AB، بدھ وہار، نئی دہلی-67

فضیل جعفری ہم عمر تو ترقی پسند تحریک کے ہیں لیکن ان کا ادبی سفر کم و بیش جدیدیت کے ساتھ شروع ہوا۔ وہ شاعر بھی ہیں اور تنقید نگار بھی۔ ان کی شاعری میں بھی ان کے مزاج کا تیکھاپن موجود ہے اور اسی لیے وہ غزل جیسی نرم و نازک اور نستعلیق صنف میں ایسے شعر بھی کہتے رہے ہیں:

ہوتے نہ لکچرر تو کئی لوگ جعفری
ساحل پہ بیچتے کہیں چھولے دہی بڑے

تنقید میں وہ شاعری کے مقابلے میں زیادہ کامیاب رہے ہیں خصوصاً ان تنقیدی تحریروں میں جو ادب پاروں پر نہیں بلکہ تنقیدوں/نقادوں پر لکھی گئی ہیں۔ اس سلسلے کا ان کا معرکہ آرا مقالہ ''کمان اور زخم'' ہے جو 1986 میں شائع ہوا، اس سے پہلے ''جواز'' میں بالاقساط شائع ہوا تھا۔ ایسی تنقیدیں میں جو ادب پاروں سے نہیں بلکہ نقادوں سے دست و گریباں ہوتی ہیں ان میں فضیل جعفری کی کامیابی کا راز بھی ان کے مزاج کے اسی تیکھے پن میں دریافت کیا جاسکتا ہے۔ ''آبشار اور آتش فشاں'' ان کے 11 تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے جو قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان سے شائع ہوا ہے۔ اس کتاب کا پہلا مضمون ہے ''پریم چند کو سمجھنے کی ایک ناتمام کوشش''۔ اس میں فضیل جعفری نے کئی اہم نکات پر روشنی ڈالی ہے۔ وہ بتاتے ہیں کہ پریم چند کے ساتھ ابھی تک انصاف نہیں ہوسکا اور اس کے لیے ذمے دار وہ ترقی پسندوں کو ٹھہراتے ہیں جو ''ان کے فوری جانشین اور وارث بھی تھے۔'' وہ لکھتے ہیں۔ ''ڈاکٹر قمر رئیس نے پریم چند پر بظاہر بہت کچھ لکھا ہے اور انھیں اس تعلق سے کافی شہرت بھی ملی مگر پریم چند کا افسانوی اوب جس تنقیدی ارتقا کا متقاضی ہے وہ ان کے یہاں نظر نہیں آتا۔'' (ص 12)

میرے خیال میں یہ معاملہ اتنا سادہ نہیں ہے اصل صورتحال یہ ہے کہ افسانوی تنقید کا اسم اعظم ابھی تک ہمارے نقادوں کے ہاتھ نہیں آیا اسی لیے اگر ایک طرف قمر رئیس ان کا حق ادا نہیں کر پاتے تو فضیل جعفری کی یہ کوشش بھی واقعتاً ناتمام ہی رہتی ہے۔ فاروقی نے ''افسانے کی حمایت میں'' میں پریم چند پر جو مضمون لکھا ہے اس میں پریم چند کے بیانیہ کا جیسا جائزہ لیا گیا ہے اس کی مثال اردو تنقید میں نہیں ملتی لیکن مشکل یہ ہے کہ فاروقی کے پاس قمر رئیس کے جتنا وقت نہیں پریم چند کے لیے کہ وہ پریم چند کے تمام افسانوں کا اسی طرح جائزہ لیں اور جن ناقدین کے پاس وقت ہے ان کا تنقیدی شعور اتنا بالیدہ نہیں چنانچہ وہ پریم چند کے موضوعات سے بحث کر کے بری الذمہ ہوجاتے ہیں۔ اس مضمون میں فضیل جعفری لکھتے ہیں ''کیا یہ بات حیرت ناک نہیں کہ ہمارے بڑے بڑے افسانہ نگاروں مثلاً منٹو، بیدی، کرشن چندر اور عصمت چغتائی وغیرہ کے وہی افسانے آج بھی زیادہ مشہور ہیں جو انھوں نے اپنے ابتدائی دور میں لکھے تھے مگر پریم چند کی زندگی کا آخری افسانہ ''کفن'' ہے جسے جدید افسانے کا نقطۂ آغاز بھی کہا جاسکتا ہے۔ ''کفن'' پریم چند کی حسیت کا وہ ہتھوڑا ہے جس کی دھمک ہر جدید افسانوی دماغ میں سنائی دیتی ہے اور جس سے کوئی افسانوی دماغ نہیں بچ سکا۔''

اس میں حیرت کی کون سی بات ہے، تاج نے 31 سال کی عمر میں ''انارکلی'' لکھ دیا اس کے بعد وہ تقریباً پچاس برس اور زندہ رہے اور مسلسل لکھتے بھی رہے لیکن ''انارکلی'' کے پائے کا دوسرا ڈرامہ نہ لکھ سے۔ تو تخلیقات کا معاملہ ایسا ہی ہوتا ہے۔ یہ کون یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہے کہ پریم چند ''کفن'' کے بعد اگر کوئی افسانہ لکھ پاتے تو وہ بھی ''کفن'' جیسا شاہکار ہی ہوتا۔ دوسرا نکتہ یہاں پر قابل غور یہ ہے کہ پریم چند اگر کچھ دن اور زندہ رہتے اور ان سے پوچھا جاتا کہ ان کا بہترین افسانہ کون سا ہے تو مجھے سو فیصدی یقین ہے کہ وہ ''کفن'' کا نام کبھی نہ لیتے۔ میرا خیال ہے کہ ''کفن'' شاہکار اس لیے ہے کہ اب ہمارے ادب میں افسانے کا جو تصور ہے اس میں انقلابی تبدیلی آچکی ہے اور چونکہ اس تبدیلی کے محرکات میں منجملہ اور باتوں کے یہ افسانہ بھی شریک ہے اس لیے اس کی دھمک ہر جدید افسانوی دماغ میں سنائی دیتی ہے۔ لیکن فکشن کے نقاد اتنے معصوم ہیں کہ وہ ان باتوں کو نہیں سمجھ سکتے۔ دوسرا مضمون ''غلام عباس کا افسانوی ادب'' ہے جو اس لحاظ سے اہم ہے کہ غلام عباس پر بہت کم لکھا گیا ہے۔ تیسرا مضمون ''گوندنی والا تکیہ: ایک مطالعہ'' ہے۔ یہ غلام عباس کے ایک نسبتاً کم معروف پہلو یعنی ناولٹ نگاری پر روشنی ڈالتا ہے۔ اس میں فضیل جعفری یہ بتاتے ہیں ''غلام عباس کے بیشتر افسانوں کی طرح اس ناولٹ میں بھی کرداروں کے درمیان کوئی ایسی حد فاصل نہیں ہے جس کی بنیاد

پر انھیں مرکزی اور ذیلی کرداروں کے خانوں میں تقسیم کیا جاسکے... دراصل یہ سارے کردار مل کر وہ اجتماعی منظر نامہ ترتیب دیتے ہیں جس کا نام ہے ''گوندنی والا تکیہ'' (ص 90)

یہی وجہ ہے کہ غلام عباس کا کوئی کردار اس طرح مشہور نہیں جس طرح منٹو کے کردار ہیں۔ چوتھا مضمون ''عصمت چغتائی کا فن'' ہے۔ یوں فضیل جعفری عصمت چغتائی کے بہت قائل نہیں ہیں جس کا اندازہ اس بیان سے کیا جاسکتا ہے ''ایک زمانے تک بیدی کا نام کرشن اور منٹو کے بعد ہی نہیں عصمت چغتائی تک کے بعد لیا جاتا تھا اور یہ کام ہماشما نہیں آل احمد سرور جیسے مشاہیر کرتے تھے۔'' (غلام عباس کا افسانوی ادب ص 28) اس کے باوجود انھوں نے عصمت کے فن کا جائزہ پوری ہمدردی اور ایمان داری سے لیا ہے وہ لکھتے ہیں۔

''میرے نزدیک عصمت کی افسانوی دنیا کا دائرہ تین عناصر سے ترتیب پاتا ہے (1) حقائق کو قامبند کرنا (2) حقیقی دنیا کی عمومی شکلوں یا ان سے متعلق نظریات کو افسانوی شکل میں پیش کرنا (3) ایسے واقعات کی مدد سے افسانہ ترتیب دینا جو حقیقت نہ ہوں لیکن حقیقت سے مشابہت رکھتے ہوں۔ ان سب کا بنیادی محور جیسا کہ پہلے عرض کیا جاچکا ہے عموماً گھر ہوتا ہے اس طرح بظاہر عصمت کی افسانوی دنیا محدود معلوم ہوتی ہے لیکن ان کی تیز اور کھلی ہوئی افسانوی آنکھ نے گھر کے در و دیوار پر چڑھے ہوئے پلاسٹر کو جس طرح کھرچا ہے اور گھر کے مختلف گوشوں کو جس طرح اجاگر اور کبھی کبھی بے نقاب کیا ہے اس پر اگر آپ ایک فاصلے سے نظر ڈالیں تو یہی دنیا خاصی بڑی معلوم ہونے لگتی ہے۔'' (ص 114)

وہ عصمت کا اصل کارنامہ 'چوتھی کا جوڑا'، 'بے کار' اور 'دو ہاتھ' جیسے افسانوں کو بتاتے ہیں۔ اس کے علاوہ اس کتاب میں سات مضامین ہیں یہ مضامین ہیں ''احمد ندیم قاسمی کا افسانوی رویہ، ایک چادر میلی سی: ایک تبصرہ، بستی۔ ایک جائزہ، اردو افسانہ اور جدید افسانہ، وارث علوی اور فکشن کی تنقید، ساختیاتی کتاب میں رد تشکیل کی ہڈی اور تھیوری، امریکی شوگر ڈیڈی اور مابعد جدیدیت۔

ان میں احمد ندیم قاسمی کا افسانوی رویہ کی بھی اہمیت ایک تو اس بات میں ہے کہ قاسمی پر ہندوستان میں بالکل نہیں لکھا گیا۔ دوسرے اس لیے بھی کہ فضیل جعفری نے ان کے زیادہ سے زیادہ افسانوں کا مطالعہ کرنے کے بعد ان پر یہ مضمون لکھا ہے اگر چہ وہ یہ اعتراف بھی کرتے ہیں کہ ''ہم کو قاسمی کے تمام افسانوں کے مطالعے کا موقع نہیں ملا۔'' (ص 125)

''وارث علوی اور فکشن کی تنقید'' اس کتاب کا سب سے عمدہ مضمون ہے جو پھر میرے اس مفروضے کی تائید کرتا ہے کہ فضیل جعفری ادب پاروں کے مقابلے میں تنقید کی تنقید لکھنے میں زیادہ کامیاب ہیں۔ یہ مضمون وارث علوی کی دو کتابوں ''فکشن کی تنقید کا المیہ'' اور ''جدید افسانہ اور اس کے مسائل'' کو سامنے رکھ کر لکھا گیا ہے۔ اگر وارث علوی کی تمام تحریروں کو دائرۂ بحث میں لایا جاتا تو ان کے پست و بلند محاکمہ زیادہ بہتر ڈھنگ سے کیا جاسکتا تھا حالانکہ وہ یہ لکھتے ہیں کہ ''اگر ہم وارث علوی کو فی الحال فکشن کا اہم ترین نقاد سمجھتے ہیں تو اس کی بنیادی وجہ ''فکشن کی تنقید کی المیہ'' اور ''جدید افسانہ اور اس کے مسائل'' نہیں بلکہ ان کی وہ تحریریں ہیں جن کا ذکر ہم نے ابھی ابھی کیا ہے'' (ص 253) لیکن عملی طور پر دوسری تحریروں کا ذکر کم سے کم کرتے ہیں اس مضمون کے دوسرے حصے میں اس کی تلافی کی کوشش البتہ کی ہے جو بہت کامیاب نہیں۔ اس میں شک نہیں کہ وارث علوی نے فکشن پر زیادہ دلچسپی سے لکھا ہے لیکن کیا یہ فکشن کی تنقید کا المیہ نہیں کہ وارث علوی جیسا نقاد جس توجہ اور انہماک کے ساتھ بیدی اور منٹو اور بلونت سنگھ پر لکھتا ہے اسی توجہ اور انہماک کا سزاوار وہ ہرچرن چاولہ اور ترنم ریاض کو بھی سمجھتا ہے۔ اس پر بھی تو فضیل جعفری صاحب کو غور کرنا چاہیے میرے خیال میں اس کی بھی اصل وجہ یہی ہے کہ فکشن کی تنقید کا اہم اعظم ابھی تک ہمارے نقادوں کے ہاتھ نہیں آیا۔

اس کتاب کے آخری دو مضامین جو مابعد جدیدیت اور گوپی چند نارنگ کی محبت میں لکھے گئے ہیں اس پر تو بڑا ہی عمدہ اور ملیح تبصرہ وارث علوی نے ذہن جدید کے نام اپنے خط میں کیا تھا جو اس مضمون کی اشاعت کے فوراً بعد ذہن جدید ہی میں شائع ہوا تھا۔ آپ وہاں سے ملاحظہ فرمائیں۔

آبشار اور آتش فشاں کی اشاعت پر قومی کونسل مبارکباد کی مستحق ہے کہ اس نے تنقیدی مضامین کا ایسا مجموعہ شائع کیا ہے جو فکشن کی تنقید میں ایک خوبصورت اضافہ ہے۔

● کلیات سراج/سراج اورنگ آبادی

مرتبہ: پروفیسر عبدالقادر سروری

صفحات: 732، قیمت: 138 روپے (دونوں جلدیں)

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک۔ 1، آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی۔ 66

مبصر: عبدالرب، 285، سابرمتی ہاسٹل، جے این یو، نئی دہلی۔ 67

اردو زبان و ادب میں اپنی اولیت کی بنا پر دکن کی ابتدائی تصانیف کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔ اردو زبان و ادب کے ارتقا کی ابتدائی صورتیں ان میں محفوظ ہیں، لیکن دکنی ادب سے متعلق موجودہ عہد کے طالب علموں کے ذہن میں اس کی اوقی زبان اور غیر مانوس لب و لہجے کو لے کر ایسا تصور پیدا ہوگیا ہے کہ اس کی جانب مائل ہی نہیں ہوتے۔ حالانکہ ولی تک آتے آتے دکن اور شمالی ہند کی ادبی اور شعری زبان میں بہت زیادہ فرق نہیں رہ جاتا۔ اور سراج

اورنگ آبادی کی شاعری کے مطالعے سے تو یہ دوئی کا احساس ختم ہی ہونے لگتا ہے۔ اسی وجہ سے سراج کو دکن کا آخری بڑا شاعر بھی کہا جاتا ہے کیونکہ اس کے بعد شمالی ہند کے اثرات بھی دکن کی شاعری پر ظاہر ہونے لگتے ہیں۔

سراج اورنگ آبادی ہمارے ان شاعروں میں ہیں جنھوں نے اردو شاعری کو بام عروج تک پہنچانے میں اہم رول ادا کیا۔ کلیاتِ سراج میں تمام مروجہ اصناف میں کلام شامل ہے لیکن بنیادی طور پر وہ غزل کے شاعر ہیں۔ سراج کے کلام میں عشقیہ جذبات اپنے فطری انداز میں جلوہ گر ہوئے ہیں۔ ان کا عشق خالصاً مجازی ہے لیکن جہاں کہیں تصوف اور اخلاق وفلسفہ کا اثر آ گیا ہے وہاں ایک عجیب حلاوت اور چاشنی پیدا ہوگئی ہے۔

سراج نے چوبیس سال کی عمر میں شعر گوئی ترک کر دی تھی اور اس کے بعد پورے طور پر تصوف کی جانب متوجہ ہو گئے تھے۔ ان کی ضخیم کلیات، ان کی صرف پانچ، چھ سال کی فکر سخن کی دین ہے۔

پروفیسر عبدالقادر سروری نے کلیات سراج سائنٹفک طریقے سے مرتب کی ہے اور سراج کے کلام کے جو مخطوطے ان کے پیش نظر رہے ہیں ان سب کی تفصیل دے دی ہے۔ ان میں وہ نسخہ بھی شامل ہے جو سراج کے مطالعے میں رہ چکا تھا۔ کلیات کی طباعت کے دوران کچھ نسخے مرتب کو ملے جن میں مزید غزلیں اور کچھ اشعار دستیاب ہوئے انھیں ضمیمے کے تحت شامل کر دیا ہے۔

کلیات میں 508 غزلیں، 11 مثنویاں، 9 رباعیاں، 1 قصیدہ، 5 مستزاد، 11 مخمس، 1 ترجیع بند اور 1 مناجات شامل ہیں۔

سروری صاحب نے 130 صفحات کا بھرپور مقدمہ لکھا ہے جس میں 65 صفحے سراج کی حیات سے متعلق ہیں بقیہ شاعری سے متعلق ہیں۔ مقدمے کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ مرتب نے اس کی تیاری میں تمام ممکنہ ماخذ تک رسائی حاصل کی ہے۔ سروری صاحب نے مقدمے میں سراج کی شاعری کا جائزہ لیتے ہوئے سراج کے معاصرین اور بعد کے شعرا سے بھی موازنہ کیا ہے جس سے مرتب کی وقت نظری کا اندازہ تو ہوتا ہی ہے ساتھ ہی سراج کی قادرالکلامی، فکر کی گہرائی اور ندرت اسلوب پر بھی بھرپور روشنی پڑتی ہے۔ مرتب نے سراج اور میر کے کئی ایسے اشعار پیش کیے ہیں جو نہ صرف ہم مضمون ہیں بلکہ کہیں کہیں تو مصرعے بلکہ اشعار بھی ایک ہو گئے ہیں۔

کلاسیکی متون کی تدریس وتفہیم یقیناً ایک دشوار مرحلہ ہے اس لیے کلاسیکی متون کے آخر میں ایک جامع فرہنگ ضرور ہونی چاہیے۔ کلیاتِ سراج میں اس کی کمی کھٹکتی ہے محض مختصر حواشی فرہنگ کا بدل ثابت نہیں ہوتے۔

کلیات سراج، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی ایک اہم اسکیم ''کلاسیکی متون کی بازاشاعت'' کا حصہ ہے۔ جو طلبہ، اساتذہ اور باذوق قارئین کے لیے کسی نایاب تحفے سے کم نہیں۔ دیدہ زیب گٹ اپ اور خوبصورت طباعت کے ساتھ ازراں قیمت پر ایسی کتابیں شائقین تک پہنچانے کے لیے کونسل مبارکباد کی مستحق ہے۔

● پریم چند کا تنقیدی مطالعہ بہ حیثیت ناول نگار

مصنف: پروفیسر قمر رئیس

صفحات: 424، قیمت: 152 روپے

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک۔ 1، آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی۔ 66

مبصر: سورج دیو سنگھ، شعبۂ اردو، مگدھ مہیلا کالج، پٹنہ یونیورسٹی، پٹنہ

پروفیسر قمر رئیس کا شمار دورِ حاضر کے ان نقادوں اور دانشوروں میں ہوتا ہے جنھوں نے اردو فکشن میں اپنی ایک الگ اور منفرد شناخت بنائی ہے۔ پریم چند کا مطالعہ اور پریم چند شناسی ان کا پسندیدہ موضوع رہا ہے۔ انھوں نے پریم چند کے حوالے سے اہم کارنامے انجام دیے ہیں۔ ہندوستانی سماج اور معاشرے کی جس نبض کو پریم چند نے چھوا تھا اسے پروفیسر قمر رئیس از سرِنو دریافت کرنے اور جانچنے پرکھنے کی بھرپور کوشش کرتے ہیں۔

زیرِ نظر کتاب ''پریم چند کا تنقیدی مطالعہ بہ حیثیت ناول نگار'' کے اب تک کئی ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ اس میں پریم چند کے تمام ناولوں کا تنقیدی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ ''سوانحی حالات'' کے عنوان کے تحت مصنف نے پریم چند کے بچپن اور ابتدائی تعلیم، ملازمت اور دوسری شادی، محبوبہ اور ڈپٹی انسپکٹری، تبادلہ، مدرسی کا نیا دور، گورکھ پور کا قیام، استعفے کے بعد، بمبئی کی ملازمت، بیماری اور وفات کے ذیلی عنوان سے پریم چند کے متعلق اہم اور مستند معلومات فراہم کرنے کی کوشش کی ہے۔ اسی طرح 'ذہنی اور فکری پس منظر' کے عنوان کے تحت ہندوستان کے عام اقتصادی حالات، مذہبی اور سماجی اصلاحات، قومی بیداری اور سیاسی جدوجہد وغیرہ کو موضوع گفتگو بنایا گیا ہے۔

'فن اور فکر کا ورثہ' کے عنوان کے تحت مصنف نے اردو کے ابتدائی ناول نگاروں مثلاً ڈپٹی نذیر احمد، رتن ناتھ سرشار، مولانا عبدالحلیم شرر اور مرزا ہادی رسوا کی ناول نگاری کا جائزہ لیا ہے۔ انھی ناول نگاروں نے ناول کی سنگلاخ سرزمین کو اس قابل بنایا کہ آگے چل کر پریم چند اپنے ناولوں میں حقیقت نگاری کا بہترین نمونہ پیش کر سکے۔

پریم چند کے ناولوں کے تنقیدی مطالعے کو مصنف نے تین ادوار میں تقسیم کیا ہے۔ مطالعے کی یہ ترتیب پریم چند کے ناولوں کی تاریخی ترتیب سے

مطابقت رکھتی ہے۔ ناولوں کے موضوعات، فنی اسالیب اور اہم کرداروں کے مطالعے کو تفصیلاً پیش کیا گیا ہے۔ 'ابتدائی دور کے ناول 1916-1903' کے زیرعنوان مصنف نے پریم چند کے ابتدائی دور کے ناولوں مثلاً اسرارِ معابد، ہم خرما و ہم ثواب، جلوۂ ایثار اور بیوہ پر گفتگو کی ہے۔ پریم چند کے ابتدائی دور کے ناول فکری وفنی لحاظ سے اتنے کامیاب نہیں جتنے کہ بعد کے ناول ہوئے۔

'دوسرے دور کے ناول' میں بازارِ حسن، گوشۂ عافیت، نرملا اور غبن جیسے ناولوں کو شامل کرکے ان کا فکری وفنی جائزہ لیا گیا ہے۔ اس دور کے ناولوں میں فکری و فنی اعتبار سے پختگی آنی شروع ہوئی ہے۔ 'تیسرے دور کے ناول' کے تحت مصنف نے چوگانِ ہستی، پردۂ مجاز، میدانِ عمل، گئودان اور منگل سوتر جیسے ناولوں کا تنقیدی جائزہ لیا ہے۔ ظاہر ہے اس دور کے ناول فکری وفنی لحاظ سے بے حد اہمیت کے حامل ہیں۔ مذکورہ بالا ناولوں میں جاگیردارانہ اور مہاجنی تہذیب کے استحصالی رخ کی عکاسی، پولیس اور پٹواریوں کی لوٹ کھسوٹ، سرمایہ دارانہ نظام کی جھلک، غیرملکی سامراج کے ناجائز تسلط کے خلاف احتجاج اور ملک کی آزادی کی جدوجہد کی جھلک نظر آتی ہے۔

'زبان اور طرزِ بیان' کے باب میں مصنف نے پہلا دور، دوسرا دور اور تیسرا دور کے ذیلی عنوان کے تحت پریم چند کی زبان اور طرزِ بیان پر روشنی ڈالتے ہوئے یہ واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ کیسے وقت اور زمانے کی مناسبت سے پریم چند کی ناول نگاری کی زبان، پیش کش اور طرزِ ادا میں تبدیلی آتی گئی۔ اس طرح 'اظہار و بیان کی خصوصیات' کے تحت مصنف نے واقعہ نگاری، مکالمہ نگاری، منظرنگاری اور ظرافت نگاری کے ذیلی عنوان سے پریم چند کی ناول نگاری کی خصوصیات، عمدہ مکالمہ نگاری، دلکش منظرکشی اور ان کی ظرافت نگاری پر روشنی ڈالی ہے۔

'پریم چند کا تصورِ حیات'، 'پریم چند کے ہیرو' اور 'پریم چند کا مرتبہ: بحیثیت ناول نگار' وغیرہ ابواب میں پریم چند کی ناول نگاری کے پس منظر و فکر و نظر اور تصورِ فن اور فن پر کارآمد گفتگو کی گئی ہے۔ کتاب کے مطالعے سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ جس طرح پریم چند گاؤں کے کسانوں، مزدوروں، محنت کشوں اور غریبوں کے دکھ درد کے سب سے بڑے نباض کہے جاتے ہیں بالکل اسی طرح پروفیسر قمر رئیس بھی پریم چند کے نباض کہے جاسکتے ہیں۔ پریم چند جن گہرائیوں میں جاکر غریب کسانوں، مزدوروں اور دیہات کے مسائل کا نقشہ اتارتے ہیں پروفیسر قمر رئیس بالکل انھی گہرائیوں میں اترتے نظر آتے ہیں۔

اس کتاب کی اشاعت کے ذریعے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے وقت کی ایک اہم ضرورت پوری کی ہے۔ اس کتاب کی طباعت بہت صاف ستھری اور دیدہ زیب ہے۔ امید ہے کہ اسے قارئین کی غیر معمولی پذیرائی حاصل ہوگی اور کتاب ہاتھوں ہاتھ لی جائے گی۔

● نغمۂ عرفاں

مترجم: ٹی این سریواستو رئیس پٹھاری

صفحات: 300، قیمت: روپے

ناشر: ٹی این سریواستو، زرنگار، مالتی باغ، مدن پورہ، وارانسی

مبصر: مخمور سعیدی، J-3/1416، کرشنا کنج ایکسٹینشن، لکشمی نگر، دہلی-92

''شریمد بھگوت گیتا'' ہندوستان کی ان مقدس کتابوں میں ہے جن کے ترجمے ہندوستان کی ہی نہیں بیرونی ممالک کی کئی زبانوں میں بھی ہوئے ہیں۔ اردو میں گیتا کے جو ترجمے ہوئے ہیں، ایک حالیہ تحقیق کی رو سے ان کی تعداد ایک ہزار کے قریب ہے۔ ان میں سے بہت سے ترجمے منظوم بھی ہیں لیکن ایسے ترجمے جو براہِ راست سنسکرت سے کیے گئے ہوں، ان کی تعداد کم ہے۔ ''نغمۂ عرفاں'' یہ ایک ایسا وصف ہے جو اس ترجمے کو خصوصی اہمیت کا حامل بنا دیتا ہے کیونکہ اسے اصل سے قریب ترین کہا جاسکتا ہے۔

''بھگوت گیتا'' کا مطلب ہے بھگوان کا گایا ہوا گیان یا نغمۂ خداوندی۔ یہ ان اشلوکوں پر مبنی ہے جو مہابھارت کی جنگ عظیم کے دوران شری کرشن کی زبان سے اس وقت ادا ہوئے جب ارجن کے دل میں عین میدانِ جنگ میں یہ خیال آیا کہ جن لوگوں کے خلاف ہتھیار اٹھانے ہیں وہ غیر نہیں، کسی نہ کسی حوالے سے سب اپنے ہیں اور اس خیال نے ارجن کو ایک تذبذب میں ڈال دیا۔ شری کرشن نے ارجن کے اس تذبذب کو دور کرنے اور انھیں اسے اس کے فرض کا احساس کرانے کے لیے جو کچھ کہا اس میں پورا ہندو فلسفۂ حیات سمٹ آیا ہے۔

''بھگوت گیتا'' اٹھارہ ابواب پر مشتمل ہے۔ ان اٹھارہ ابواب میں شری کرشن اور ارجن کے درمیان جو مکالمہ ہوا ہے اس میں ویدوں اور اپنشدوں کی تعلیمات باہم شیر و شکر ہوگئی ہیں اور وہ عقائد جن پر ان تعلیمات کی بنیاد ہے پوری طرح واضح ہوگئے ہیں۔ ہندوتو جسے ہمارے زمانے میں کچھ سیاسی معنی بھی پہنا دیے گئے ہیں دراصل انھی تعلیمات پر مبنی ہے جو ہندو طرزِ معاشرت، ہندو اندازِ نظر اور ہندو طریقِ بود و باش کی عکاسی کرتا ہے اور سبھی مذہبوں اور ملکوں کے درمیان رواداری کا حامی ہے لیکن جب انصاف پر ناانصافی غلبہ پانے کی کوشش کرے تو اس کی مزاحمت اور تدارک ضروری ہے اور اس نیک مقصد کے حصول کے لیے اگر ہتھیار اٹھانے کی نوبت آجائے تو اس سے بھی گریز نہیں کرنا چاہیے؟ اس پر بھی زور دیتا ہے۔

گیتا کے باب اول میں ارجن جس تامل اور تردد میں گھرے نظر آتے ہیں، اس کے اٹھارویں یعنی آخری باب تک پہنچتے پہنچتے اس تامل اور تردد کی جگہ عزم اور حوصلہ لے لیتا ہے اور ارجن کے تمام شکوک وشبہات کا ازالہ ہو جاتا ہے۔

گیتا میں ترک دنیا کی تلقین کہیں نہیں ہے بلکہ زور دے کر کہا گیا ہے کہ دنیا میں رہ کر دنیوی زندگی کے جو تقاضے ہیں، انھیں پورا کرنا ضروری ہے کہ یہ جیو آتما کا فرض ہے لیکن جو کام کیا جائے وہ کسی ذاتی غرض سے نہیں، بے غرض ہو کر پرم آتما کی خوشنودی کے لیے کیا جائے اسی میں انسان کی نجات ہے۔

سریواستو صاحب نے ہر باب کے شروع میں اصل ترجمے سے پہلے، اس باب کی معنویت پر چند جملے بھی تحریر کیے ہیں جن سے اس باب کے مطالب کو بہتر طور پر سمجھا جا سکتا ہے۔ ترجمہ اصل سے کتنی مطابقت رکھتا ہے، یہ تو وہی کہہ سکتا ہے جو سنسکرت متن سے واقف ہو لیکن ترجمے میں بڑی حد تک روانی اور سلاست ہے۔ کہیں کہیں روانی میں کمی بھی آ گئی ہے جسے ضرورتِ شعری سمجھ کر نظر انداز کیا جا سکتا ہے لیکن بیشتر مقامات پر لفظ غلط تلفظ کے ساتھ نظم ہوئے ہیں اور تذکیر وتانیث کا بھی خیال نہیں رکھا گیا ہے۔ مثلاً

یہ برادر کشی کیسی، آخرش سب ایک خوں۔۔۔ (کشی کو مشدد باندھا گیا ہے)
جان بھی لے لیں ہماری وہ یہاں گر بے وجہ۔۔۔ (وجہ غلط تلفظ کے ساتھ)
باپ کا بھاگی بنائے گا ہمیں کنبہ کشی۔۔۔ (کنبہ کشی کو مذکر باندھا ہے)
کہو ماد ھو ہم سکھی جائیں گے کیسے بھلا۔۔۔ (مصرعہ ناموزوں ہے)
ہے نہ اس کا رگر سے قطعی اپنی خوشی۔۔۔ (قطعی کو مشدد کر دیا ہے)

یہ چند مثالیں ہیں، ورنہ پوری کتاب میں زبان و بیان کی بدیہی غلطیاں موجود ہیں۔ بہتر ہو کہ مترجم آئندہ اشاعت میں پورے متن پر نظر ثانی کر لیں۔

● وحشت شناسی

مصنف: سید علی عرفان نقوی

صفحات: 112، قیمت: ندارد

ناشر: شعبۂ اردو، مختر پور کالج، 3/2 پتمبر سرکار لین، کولکاتا-700023

مبصر: درخشاں زریں لیکچرار شعبۂ اردو، مختر پور کالج، کولکاتا

رضا علی وحشت کلکتوی کی شخصیت اور شاعری کی تفہیم میں ''وحشت شناسی'' ایک قابل قدر اضافہ ہے۔ وحشت کلکتوی کے 125 ویں جشن ولادت پر مختر پور کالج کے شعبۂ اردو کی جانب سے شائع کی گئی، یہ دستاویزی حیثیت کی کتاب ہے۔ رضا علی وحشت جو بنگال میں اپنی شعری وادبی خدمات کے لیے طوطیِ بنگال، غالب دوراں اور استادِ زماں جیسے القاب سے نوازے گئے، آج ان کی خدمات پر وقت کی دبیز پرتیں جمتی جا رہی ہیں۔ ایسے میں وحشت کی یاد دلانے اور ان کا مقام متعین کرنے کی سمت میں یہ کاوش قابل قدر بھی ہے اور لائق تقلید بھی۔

''وحشت شناسی'' میں سید علی عرفان نقوی نے کالج کے پرنسپل ڈاکٹر شمس العالم کی تقریظ، اپنی عرض داشت (حق گوئی وبے باکی) اور مکتوبات وحشت (نایاب اور غیر مطبوعہ) کے علاوہ گیارہ مضامین شامل کیے ہیں۔ ان میں پہلا مضمون ''المومن میں کلام وحشت'' پروفیسر اسد الزماں کا ہے۔ اس مضمون میں پروفیسر اسد الزماں نے رسالہ ''المومن'' (کولکاتا) میں شائع شدہ ان کی غزلوں کا ''تراینہ وحشت'' میں شامل غزلوں سے موازنہ کرتے ہوئے ان کے متن میں حذف واضافے سے متعلق اپنی تحقیقات پیش کی ہیں۔ دوسرا مضمون ڈاکٹر یوسف تقی کا ''وحشت کی شناخت'' ہے جس میں انھوں نے وحشت کے عقیدت مندوں اور غالب ومومن کی تراکیب اور طرز ادا کے تناظر میں ان کی اپنی انفرادی شناخت کی بازیافت کی ہے۔ تیسرا مضمون ''علامہ رضا علی وحشت'' پروفیسر مشتاق احمد مرحوم کا ہے، اس مضمون میں انھوں نے وحشت کے دونوں مجموعۂ کلام ''دیوان وحشت'' (1909) اور ''تراینہ وحشت'' (1950) کی غزلوں کا تنقیدی جائزہ پیش کیا ہے۔ چوتھا تاثر ڈاکٹر ایم. اے. نصر کا ''علامہ رضا علی وحشت'' ہے جس میں ''دیوان وحشت'' اور ''تراینہ وحشت'' کی اہمیت وانفرادیت سے بحث کی گئی ہے۔ پانچواں مضمون ڈاکٹر ابو بکر جیلانی کا ''شاکر کلکتوی اور علامہ وحشت'' ہے جس میں علامۂ وحشت میں شاکر کی شاعری اور استاد کے درس کے روّیہ قبول کے عمل پر تنقیدی بحث اور ''بزم شاکری'' کی اردو شعر وادب کے فروغ میں نمایاں کارکردگی کا مفصلاً ذکر کیا ہے۔ چھٹے مضمون ''خطوط کی روشنی میں غالب ووحشت کا تقابلی مطالعہ'' میں مرتب کتاب سید علی عرفان نقوی نے موازنے کے بجائے وحشت کے خطوں سے ان کی شخصیت کو سمجھنے اور ان کے توسط سے ان کی شاعری کے انفرادی رنگ کو پہچاننے کی کوشش کی ہے۔ ساتویں مضمون ''وحشت سے متعلق چند غیر مطبوعہ واقعات'' میں اشرف احمد جعفری نے وحشت کی شخصیت کے چند نمایاں پہلو: انداز شرکت بزم، معاملہ فہمی، طبیعت کی شوخی اور انسانی ہمدردی پر تحقیقی ومعروضی مطالعہ پیش کیا ہے۔ آٹھواں مضمون ''مسلم انسٹی ٹیوٹ میں وحشت پر سیمنار'' پر ایک ''رپورتاژ'' ہے جس میں شمشیر عالم نے رپورتاژ کے فن سے قطع نظر سیمنار میں پڑھے گئے صرف چار مقالہ نگاروں کے مضامین پر اپنا تنقیدی نوٹ سپرد قلم کیا ہے۔ نواں مضمون ''وحشت کا شاعرانہ حسن'' میں محمد شاہد جمیل نے وحشت کی شاعری اور شخصیت سے متعلق اپنے خیالات کا بہتر اظہار کیا ہے۔ دسویں مضمون ''مضامین وحشت کا تنقیدی جائزہ'' میں محمود ریاض

نے ''مضامین وحشت'' کا جائزہ لیا ہے جو 1908 سے 1954 کے درمیان لکھے گئے اور جسے مغربی بنگال اردو اکادمی نے 1982 میں شائع کیا ہے۔ آخری مضمون ''طوطی بنگالہ: رضا علی وحشت'' ہے جس میں محمد شمیم نے وحشت کی شاعری پر اپنے تاثرات پیش کرنے کے ساتھ ان کا مقام متعین کرنے کے لیے عملی اقدام پر زور دیا ہے۔

''وحشت شناسی'' کی ترتیب وتدوین سے متعلق مرتب کتاب نے اپنی عرض داشت ''حق گوئی و بے باکی'' میں فروغ شعر وادب کے تئیں شعبے کی کارکردگی کی تاریخ، مذکورہ سیمینار کی غرض وغایت اور مشمولہ مضامین اور مضمون نگاروں کا اجمالی تعارف پیش کیا ہے۔ انھوں نے وحشت شناسی کے باب میں انڈو پاک سے شائع شدہ رسائل وکتب کا احاطہ تو کیا ہے لیکن وحشت کے شہر کولکاتا سے روزنامہ ''آبشار'' نے وحشت پر جو خاص نمبر شائع کیا تھا اس کا ذکر نہیں ہے۔ مشمولہ مضامین اہم ہیں لیکن پروف ریڈنگ میں غلطیاں رہ گئی ہیں۔ مثلاً راقم الروف/راقم الحروف، دوساں/دسواں، شارہ/شمارہ، الموں/المومن، غذل/غزل، ماضوعات/موضوعات، مصنیفوں/مصنفین جیسے الفاظ میں یہ تسامحات دیکھے جاسکتے ہیں۔ بعض جگہ پر شعروں کے متن میں غلطیاں راہ پا گئی ہیں۔ جملوں میں رموز اوقاف کا عدم اہتمام ہے جس سے قرات اور تفہیم میں الجھن پیدا ہوتی ہے۔ کئی جگہوں پر تذکیر وتانیث کی غلطیاں بھی ہیں جیسے تیسری شعر، اہل کمال کے خدمات، پورے ایمانداری سے، جنوں کے نذر ہوگیا، غزلیہ شاعری کی تناظر میں، وحشت کی اتباع، کس قدر ہے ان دونوں اردو زباں بدلا ہوا وغیرہ۔ ان تسامحات سے قطع نظر ''وحشت شناسی'' وحشت کی شاعری اور شخصیت کی تفہیم کے باب میں قابل قدر کاوش کہی جاسکتی ہے۔

● بدچلن (افسانوی مجموعہ)

شاعر: ڈاکٹر کیول دھیر

صفحات: 280، قیمت: 200 روپے

ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، گلی عزیز الدین وکیل، لال کنواں، دہلی-6

مبصر: عزیز احمد خاں، ریسرچ اسکالر، شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی 25

زیر تبصرہ کتاب اردو کے معروف افسانہ نگار ڈاکٹر کیول دھیر کے گذشتہ نصف صدی میں شائع شدہ افسانوں کا انتخاب ہے۔ یعنی ان کی افسانہ نگاری کی پچاسویں سالگرہ پر یہ مجموعہ منظر عام پر آیا ہے۔

ڈاکٹر کیول دھیر کے افسانوں کے چودہ سے زیادہ غیر ملکی زبانوں میں تراجم ہوچکے ہیں۔ نیز موصوف اپنی کہانیوں پر کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، عصمت چغتائی، وزیر آغا، احمد ندیم قاسمی جیسے اکابرین سے داد وتحسین حاصل کرچکے ہیں۔

اس مجموعے میں کل اکتیس افسانے شامل ہیں جنھیں تین حصوں میں تقسیم کردیا گیا ہے: ایک طرح کی کہانیاں، دوسری طرح کی کہانیاں، تیسری طرح کی کہانیاں، اور تینوں حصوں میں بالترتیب اٹھارہ، آٹھ اور چھ افسانے ہیں۔

مجموعے میں شامل افسانوں کے موضوعات کا متنوع یہ ثابت کرتا ہے کہ افسانہ نگار نے کسی ایک طبقے، مخصوص معاشرے اور موضوعات تک خود کو محدود نہیں رکھا بلکہ سماج کے بیشتر قابل توجہ مسائل کو موضوع بنایا ہے اور نہایت خوبی سے انھیں برتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ جہاں ایک طرف رومانی انداز کی کہانیاں قاری کو مسرور ومسحور کرتی ہیں وہیں سماج کے سلگتے مسائل پر مبنی کہانیاں بہت کچھ سوچنے پر مجبور کردیتی ہیں۔

ڈاکٹر کیول دھیر کے یہاں مقبول عام موضوع پر بھی افسانے ملتے ہیں مثلاً ''محبت'' ایک اہم موضوع ہے ان کے افسانوں کا، لیکن ان کا امتیاز یہ ہے کہ انھوں نے زندگی کی دوسری سچائیوں کو نگاہوں سے اوجھل نہیں ہونے دیا۔ مثال میں کئی افسانے پیش کیے جاسکتے ہیں لیکن ''تم وہی ہو''، ''داشتی''، ''جذبوں کا کھیل'' وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

ان کے اکثر افسانے ذہن ودل کو جھنجھوڑتے ہیں۔ کئی افسانے ایسے بھی ہیں جو دکھ درد سے شروع ہوکر روشن مستقبل کا اشاریہ بن جاتے ہیں۔

ڈاکٹر کیول دھیر کے افسانوں کا ایک اہم موضوع ''سیاست'' بھی ہے۔ سیاست کو آج ہمارے معاشرے میں جو حیثیت حاصل ہوچکی ہے اور ہمارے سماج اور طرز زندگی پر اس کا جو اثر پڑا ہے نیز اس کے نتائج مذہبی منافرت اور فرقہ واریت کی شکل میں جس طرح ظاہر ہوئے ہیں انھیں بھی افسانہ نگار نے فنکارانہ چابکدستی سے پیش کیا ہے۔ ''ہم دونوں''، ''لہو کا رنگ''، ''دہشت'' وغیرہ افسانے اس کی مثال ہیں۔ ایک اور اہم موضوع ''جنس'' کو بھی افسانہ نگار نے اپنایا ہے اور کئی افسانوں میں واشگاف انداز میں یا زیریں لہر کے طور پر اپنی فنکارانہ مہارت کے ساتھ برتا ہے۔ ان تمام خصوصیات کے ساتھ یہ بھی ہے کہ بعض افسانے بہت مختصر ہیں لیکن اس کے باوجود موضوع سے انصاف کرتے ہیں۔ کیول دھیر کے افسانوں کی زبان سادہ لیکن نہایت دلنشین اور شگفتہ ہے۔

صاف ستھری طباعت، دیدہ زیب گٹ اپ اور مناسب قیمت جیسی کئی خوبیوں کے ساتھ ایک کمی جو شاید اردو کتابوں کا مقدر بن چکی ہے کہ پروف ریڈنگ کی بے شمار غلطیاں راہ پا گئی ہیں۔

امید ہے ادبی حلقوں میں اس کتاب کی خاطر خواہ پذیرائی ہوگی۔

شرجیل احمد خاں

بدی کا انجام

قدیم یونان میں ڈائڈلس (Daedalus) نام کا ایک شخص رہتا تھا۔ یونان کے لوگ اس کی بڑی عزت کرتے تھے۔ وہ خوبصورت مجسمے، برتنوں، محرابوں اور دریچوں پر دل آویز نقش ونگار بناتا تھا۔ اس نے ایک حیرت انگیز بھول بھلیاں بنائی تھی جس میں کئی پر پیچ راستے تھے۔ ایک بار کوئی اس کے اندر چلا جاتا تو اس کے لیے باہر نکلنا ناممکن ہو جاتا۔

یونان کے قریب ہی جزیرہ کریٹی (Crete) تھا جس کا راجا مینوس (Minos) تھا۔ تھا تو وہ بہت نیک دل لیکن کبھی کبھی دشمنی پر بھی اتر آتا تھا، جیسا کہ ڈائڈلس کو بعد میں تجربہ ہوا۔ مینوس کے قبضے میں ایک دہشت ناک دیو تھا جس کا نام مناٹاور (Minotaur) تھا۔ راجا اس دیو کو ایک ایسی جگہ قید میں رکھنا چاہتا تھا جہاں سے وہ بھاگ نہ سکے۔ اسی غرض سے ڈائڈلس سے اس نے بھول بھلیاں (Labyrinth) بنوائی تھی۔ مناٹاور اسی بھول بھلیاں میں مقید تھا جہاں کے پر پیچ اور تنگ راستوں سے باہر نکلنا بہت دشوار تھا۔

بچو! ہم بھول بھلیاں کا قصہ یہیں چھوڑتے ہیں۔ پھر کبھی بھول بھلیاں اور مناٹاور کی کہانی سنائیں گے۔ اب ہم لوگ کچھ دیر کے لیے ایتھنز (Ahtens) چلیں۔ ڈائڈلس کا، پرڈکس (Perdix) نام کا ایک بھتیجا تھا۔ پرڈکس وہ تمام علوم اپنے چچا سے سیکھ لینا چاہتا تھا جن کی وجہ سے اس کے چچا نے اتنی شہرت پائی تھی۔ ڈائڈلس نے اپنے بھتیجے کو وہ تمام علوم سکھا دیے جو اسے معلوم تھے لیکن بعد میں اسے احساس ہوا کہ کہیں شاگرد اپنے استاد سے سبقت نہ لے جائے۔ اس کو اپنے بھتیجے سے نفرت ہونے لگی۔ پرڈکس نے بہت کم عمری میں کپاس ایجاد کر لیا تھا۔ ایتھنز والے اس ایجاد سے بہت خوش تھے۔ ایتھنز والوں کا خیال تھا کہ پرڈکس اپنے چچا سے ضرور سبقت لے جائے گا۔ ڈائڈلس کی نفرت روز بروز بڑھتی گئی اور وہ سوچنے لگا کہ کسی طرح پرڈکس سے نجات حاصل کی جائے۔

ایک شام جب سورج غروب ہو رہا تھا، وہ دونوں چچا بھتیجے ایک پہاڑی کے دامن میں ٹہل رہے تھے۔ پرڈکس بہت خوش تھا۔ وہ اپنے چچا سے کہہ رہا تھا کہ اس نے مصمم ارادہ کر لیا ہے کہ وہ بڑی ایجاد کرے گا۔ ڈائڈلس کی نیت خراب تھی۔ اس نے یک بہ یک پرڈکس کا بازو تھام لیا اور اسے پہاڑی سے نیچے سمندر میں دھکیل دیا۔ پرڈکس سمندر میں ڈوب کر مر جاتا اگر عقل وہنر کی دیوی منروا (Minerva) نے اس کی مدد نہ کی ہوتی۔ منروا نے پرڈکس کو ایک چکور میں تبدیل کر دیا اور وہ سمندر کے اوپر سے اڑ گیا۔ ڈائڈلس یہ سوچ کر خوف زدہ ہوا کہ اگر ایتھنز والے اس کے جرم سے واقف ہو گئے تو اس کے ساتھ بہت برا سلوک کریں گے۔ اس لیے وہ اپنے چھوٹے بیٹے اکارس (Icarus) کو ساتھ لے کر جزیرہ کریٹی (Crete) بھاگ گیا جہاں راجا مینوس نے اس کا کافی گرم جوشی کے ساتھ استقبال کیا۔ لیکن جلد ہی ڈائڈلس کا راجا مینوس سے جھگڑا ہو گیا۔ مینوس نے ڈائڈلس اور اس کے بیٹے اکارس کو جزیرے میں قید کر لیا۔ ڈائڈلس قید کی زندگی سے بہت پریشان ہو گیا۔ وہ دن، رات سوچتا رہتا کہ کوئی سبیل نکلے اور وہ قید سے رہائی حاصل کر لے، لیکن اس کو ایسی کوئی کشتی نہیں ملی جس پر بیٹھ کر وہ بھاگ نکلتا۔ اگرچہ وہ دن بھر سفید کشتیوں کو سطح آب پر حسرت بھری نظروں سے بہتے ہوئے دیکھتا، لیکن یہ کشتیاں اس کے اختیار میں نہیں تھیں۔ کاش! ایسی کوئی کشتی اس کے اختیار میں آ جاتی۔

ایک دن ڈائڈلس کے بیٹے اکارس نے دیکھا کہ اوپر آسمان میں پرندے ادھر ادھر اڑ رہے ہیں۔ اڑتے اڑتے کبھی وہ سمندر سے بہت قریب آجاتے جہاں سفید کشتیاں سطح آب پر رواں ہوتیں۔ یہ دیکھ کر وہ اپنے باپ سے بولا ''ابّا جان دیکھیے : یہ کشتیاں گویا بڑے بڑے پنکھ والے پرندے ہیں جو سطح آب پر رواں ہیں۔ ٹھیک اسی طرح جس طرح پرندے ہوا میں اڑتے ہیں''۔ ڈائڈلس چونک اٹھا۔ اس کے ذہن میں ایک خیال آیا۔ کیوں نہ وہ اپنے اور اپنے بیٹے کے لیے پنکھ بنائے جن کی مدد سے وہ دونوں اس جزیرے سے فرار ہو جائیں۔ اسی شام وہ دو جوڑے پنکھ بنانے کے لیے بیٹھ گیا۔ اس نے بہت سے پروں کے ٹکڑوں کو جوڑا اور بڑی ہنرمندی سے چار پنکھ بنا لیے۔ دو پنکھ اس نے ملائم موم سے اپنے بیٹے اکارس کے کاندھوں میں چپکا دیے اور اسی طرح دو پنکھ اپنے کاندھوں میں لگا لیے اور تب ڈائڈلس کانپتی ہوئی آواز میں اپنے بیٹے سے مخاطب ہوا... ''اکارس میرے بیٹے! بڑی ہوش مندی سے میرے پیچھے پیچھے اڑتے رہو۔ اگر تم سمندر کی سطح سے قریب ہو گئے تو تمھارے پنکھ بھیگ کر بھاری ہو جائیں گے اور اگر تم سورج کے زیادہ قریب آگئے تو موم پگھل جائے گا اور تم نیچے گر جاؤ گے۔ لہٰذا نہایت ہوش مندی کے ساتھ میرے پیچھے پیچھے اڑتے رہو'' پھر پیار سے اس نے اپنے بیٹے کو چوما اور سلامتی کی دعائیں دیتے ہوئے اسے اڑنے کے لیے ہری جھنڈی دکھا دی۔ دو بڑے بڑے پرندوں کی طرح دونوں باپ بیٹے اڑنے لگے۔ نیچے مچھیروں اور ملاحوں نے جب ان کو اپنے سر کے اوپر اڑتے ہوئے دیکھا تو انھوں نے سمجھا کہ وہ کوئی دیوتا ہیں۔ انھوں نے عقیدت سے اپنے سر جھکا لیے۔ دونوں ہوا میں اڑتے رہے۔ باپ کبھی مڑ کر پیچھے دیکھ لیتا کہ اس کا بیٹا اکارس بخیر تو ہے۔

کچھ دیر تک تو اکارس اپنے باپ کے پیچھے پیچھے اڑتا رہا، لیکن پھر اس کا جی چاہا کہ وہ خوب اونچا اڑے اور سورج سے بغل گیر ہو جائے، لیکن جیسے جیسے وہ اوپر اٹھتا گیا سورج کی تپش اس کے پنکھوں پر اثر کرنے لگی۔ یہاں تک کہ سورج کے قریب پہنچتے ہی گرمی کی شدت کے باعث موم پگھل گیا اور پنکھ کاندھوں سے الگ ہو گئے۔ اب کوئی چیز نہیں رہ گئی تھی جس کی مدد سے اکارس ہوا میں اڑتا رہتا۔ وہ تیزی سے نیچے گرتا گیا۔ اس نے سراسیمگی کی حالت میں باپ کو مدد کے لیے پکارا۔ باپ نے جب دیکھا کہ اس کے بیٹے اکارس کا جسم لہروں میں ڈوب گیا ہے اور پنکھ پانی پر تیر رہے ہیں تب ڈائڈلس تیزی سے اڑ کر اس جگہ آیا اور بیٹے کی لاش کو اپنے ناتواں کاندھوں پر اٹھائے تیر کر جزیرے میں پہنچا۔

کانپتے ہاتھوں سے اس نے ایک قبر کھودی اور اپنے دل کے ٹکڑے کو سپرد خاک کر دیا۔ جب وہ قبر کھود رہا تھا، اس نے ایک عجیب سی چیخ سنی۔ اس نے اپنا سر اوپر اٹھایا اور دیکھا کہ ایک چکوری (Partridge) چیختی ہوئی اس کے سر پر چکر کاٹ رہی ہے۔ تب اسے پرڈکس (Perdix) کا خیال آیا جسے اس نے پہاڑ کی چوٹی سے سمندر میں دھکیل دیا تھا۔ اس وقت اسے یہ احساس ہوا کہ اس کے بیٹے کی موت اس کے جرم کی سزا ہے۔

بہت دنوں تک وہ جگہ اکارس (Icarus) جزیرے کے نام سے مشہور رہی اور سمندر جس میں اکارس ڈوبا تھا اکارین (Icarian) سمندر کہلایا۔ دیکھا بچو! برے کام کا انجام ہمیشہ برا ہی ہوتا ہے۔!!

□□□

پتہ:

3-Bhikan Pur, Bhagalpur-812001 (Bihar)

پچھلے دنوں حضرت پیر محمد شاہ لائبریری اینڈ ریسرچ سینٹر، احمد آباد کے زیر اہتمام مولانا جلال الدین رومی پر ایک قومی سیمینار کا اہتمام کیا گیا
تصویر میں مہمان خصوصی جناب شنکر سنگھ واگھیلا کے ساتھ ڈاکٹر علی جاوید، ڈاکٹر عبدالودود اظہر اور کچھ مقامی معززین کو بھی دیکھا جاسکتا ہے۔

حضرت پیر محمد شاہ لائبریری اینڈ ریسرچ سینٹر، احمد آباد میں مولانا جلال الدین رومی قومی سیمینار کے موقعے پر ڈاکٹر علی جاوید اور جناب وارث علوی۔

Date of Publication : 24/06/2008
Date of Dispatch : 25 & 26 of advance month

URDU DUNIYA Monthly, July 2008, Vol. 10, Issue: 7
National Council for Promotion of Urdu Language
Department of Higher Education, Ministry of H.R.D., Government of India

قومی اردو کونسل کا معتبر علمی جریدہ

''فکر و تحقیق''

جو ہر سہ ماہی پر دعوت فکر دینے والے تحقیقی مواد کے ساتھ منظر عام پر آتا ہے

جس میں شائع ہونے والے مضامین کا خاصہ ہے معلوم حقائق کی چھان بین اور نا معلوم حقائق کی دریافت

صرف ایک جریدہ نہیں، ماضی کے اندوختوں اور حال کے
اکتسابات سے مستقبل کو مالا مال بنانے کی ایک تحریک

خود بھی اس رسالے کے خریدار بنیں اور دوسروں کو بھی اس کی خریداری کا مشورہ دیں۔

ہندوستانی خریداروں کے لیے سالانہ قیمت: 100 روپے، فی شمارہ 25 روپے

سالانہ قیمت بذریعہ ڈرافٹ، منی آرڈر یا چیک NCPUL, New Delhi کے نام ارسال کریں۔

دہلی سے باہر کے خریدار صرف ڈرافٹ یا منی آرڈر ہی ارسال کریں۔

غیر ملکی خریداروں کے لیے

ممالک	سادہ ڈاک آرڈینری	سادہ ڈاک رجسٹرڈ	ہوائی ڈاک آرڈینری	ہوائی ڈاک رجسٹرڈ
پاکستان	172 روپے	184 روپے	256 روپے	316 روپے
نیپال	160 روپے	228 روپے	292 روپے	360 روپے
بنگلہ دیش	146 روپے	174 روپے	238 روپے	306 روپے
دیگر ممالک	160 روپے	220 روپے	336 روپے	396 روپے

Printed and Published by Dr. Ali Javed, Director, NCPUL on behalf of NCPUL and printed at S. Narayan & Sons, B-88, Okhla Indl. Area, Phase-II, New Delhi-110020 and published at NCPUL, West Block-1, Wing-6, R.K. Puram, New Delhi-110066, Editor : Dr. Ali Javed, Tel : 26103381, 26103938